HYDERABAD-

R.NO. 2136/37

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ بصارف رجسٹری سالنامہ)

ہندوستان	پاکستان
نو روپے	دس روپے
۵۰ نئے پیسے	

قیمت فی کاپی

ہندوستان	پاکستان
۷۵ نئے پیسے	

تصانیف نیاز فتح پوری

من ویزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت
مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ماروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے جلد (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے جلد (علاوہ محصول)

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا اور ۶۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا

سلکی پلین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائلن
ننون

کپڑا

سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا

اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ عمدہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ بی۔ بی روڈ امرتسر

تار کا پتہ - رین (Rayon.)
ٹیلیفون :- 2562

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹیڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور موی (سیلوفین) کاغذ

آپ بھارت کی کسی بھی زبان میں تار بھیج سکتے ہیں

بشرطیکہ پیغام
دیوناگری رسم الخط میں ہو

انگریزی میں تار بھیجنے کے لئے جو سہولیات دستیاب ہیں، اب وہ دیوناگری رسم الخط میں تار بھیجنے کے لئے بھی حاصل ہیں ـــــ مبارک باد کے تار (مبارک باد کے جملے ہندی میں) ڈی لکس تار، اشتہاری تار، بیماری وحادثے کے ترجیحی تار (پرائرٹی میسیج لائٹ میسلی گرام) میسلی فون پر تار (فونوگرام) تار کے مختصر پتوں کی رجسٹریشن ـــــ یہ سروس اب قریباً قریب ۵۰۰ تار گھروں میں دستیاب ہے۔

بھارتی زبان میں تار بھیجنے کی
سروس سے فائدہ اٹھائیے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے
پوسٹس اینڈ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ

DA 38/51

سالنامہ ۱۹۶۰ء نیاز کا "انشائیہ لطیفہ" نمبر، قیمت تین روپیہ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہو گیا اور مئی کا پرچہ ۱۰ روپیہ ۸۵ پیسہ میں وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۷	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۶۰ء	شمار ۴

ملاحظات ---------- ۴
تصوف - مولانا آزاد کی نظر میں --- رفیع اللہ عنایتی --- ۶
اغلاطِ آتش ---------- ۱۰
تصوف پر ایک نظر ---------- ذکا صدیقی ایم۔ اے --- ۱۱
کائنات کی وسعت ---------- ۱۴
صوفی کی فلاسفہ ---------- نواب محمد عباس طالب صفوی -- ۱۵
ہندوؤں کا موقف (مسلم حکومتوں کے زمانہ میں) - نیاز فتحپوری ۲۰
میر کی شاعری اور تصویر --- یوسف شریف الدین بی اے ۲۶
اُردو ادب اور تلمیحات ---- محمود نیازی ---------- ۲۹
آبِ حیات - تذکرہ یا تاریخ --- اقرار احمد عباسی ---- ۳۳
تکملۂ رُباعی ---------- سحر عشق آبادی ---------- ۳۷
باب الاستفسار (نماز کے اوقات) - سید عبد الکریم ---- ۳۹
پہ انسان (انشائیہ) نظیر صدیقی ---------- ۴۱
مطبوعات موصولہ ---------- ۴۴
منظومات ۵۳ { ایم۔ اے حفیظ - شفقت کاظمی / رعنا بلسوی - سعیدہ اختر / پروفیسر شور - متین نیازی / غنی احمد فنی - کاوش بدری

پاکستان کے خریداروں کے لئے آسانی

(چندہ کی وصولی ذریعہ وی۔ پی)

پاکستان کے جن حضرات کا چندہ ختم ہو جاتا ہے وہ منی آرڈر کی روانگی میں زیادہ تاخیر کر دیتے ہیں اور نگار انھیں بروقت نہیں ملتا۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا چندہ وی۔ پی کے ذریعہ سے حاصل کیا جائے۔

یہ وی۔ پی، ہماری شاخ ادارۂ ادب عالیہ C/50 رضویہ کالونی کراچی سے بھیجے جائیں گے۔ وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۵۹ء میں ختم ہو گیا تھا اور منی آرڈر وصول نہیں ہوا، ان کے نام بھی سالنامہ سے لے کر اس وقت تک کے پرچے ذریعہ وی پی روانہ ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں ادارۂ مذکور سے خط و کتابت کی جائے۔

سالانہ چندہ کا منی آرڈر آپ ادارۂ مذکور کو بھی بھیج سکتے ہیں اور اس پتہ پر بھی :-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ کراچی

عید را در شہر ما رسم مبارکباد نیست

آج یوم عید ہے اور مسرت و نشاط کا وہ دن جس کا تصور، اپنے ایک مدحیہ قصیدہ میں عرفی نے اس طرح پیش کیا تھا

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہِ خدا و شہ دیہیم

لیکن آج نہ وہ ناز و نعیم کی بہرہ مندی ہے اور نہ وہ ادائے کجکلاہی! ——— چند صدیوں میں اتنا عظیم ذہنی انقلاب — اتنا بڑا نفسیاتی تفاوت! ——— آخر کیوں؟

کیا اس لئے کہ مسلمان اس وقت زیادہ مفلس و نادار ہے؟ ——— غلط ——— کیونکہ آج بھی وہ بہت سی بے معنی و لغو تفریحات کے لئے تہیدست نہیں ——— کیا اس لئے کہ وہ مجبور و بیدست و پا ہے؟ ——— یہ بھی غلط ——— کیونکہ آج اس پر کوئی جسمانی یا ذہنی پابندی عاید نہیں۔

پھر اس ماتمزدگی و سوگواری کا کوئی سبب اور ہونا چاہئے، جو غالباً اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا "احساس اجتماعی" بالکل محو ہو چکا ہے۔ کیونکہ مسرت و نشاط کا تعلق نہ دولت سے ہے نہ اسباب تن آسانی سے، بلکہ ایک خاص ولولہ و جوش سے جو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی احساس کی قوت سے ابھرتا ہے اور ہم اسی سے محروم ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں میں یہ احساس ایک محدود قسم کا ثقافتی احساس ہے، لیکن اسلام کا یہ احساس بین الاقوامی نوعیت کا احساس ہے اور بعید و بے پایاں!

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا کو تفریق مسلک و ملت، امتیاز ملک و وطن کے آئینہ میں دیکھا جاتا تھا، لیکن اسلام نے ان تفوق و امتیاز کو مٹا کر دو اجتماعیت کا ایک کائناتی تصور پیش کر کے جملہ بنی نوع انسان کو ایک ہی رشتہ سے وابستہ ہو جانے کی دعوت دی جس کا نام رشتۂ انسانیت و بشریت ہے، اور نظامی کی زبان میں:-

این خرابات مغان ست و رو رندان ست — شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود
ہر چہ در حلقۂ آفاق دریں جا حاضر ست — موحد و برہمن و گبر و نصاریٰ و یہود

یعنی وہ مقام بلند، جہاں ——— ہر سایۂ خدا سے شکن طرۂ کلاہ ست
اور جہاں بقول جلال اسیر ——— میسنم بر سر گلے تا خارے از پا نکشم

لیکن آج یہ سب کچھ خواب و خیال سے زیادہ نہیں، پھر بتائیے کہ اس کا محاسبہ کس سے کیا جائے؟ ——— اُن اکابر ملت سے جن کا مشغلہ "عاقبت گمری و دستار" کے سوا کچھ نہیں، یا اُن علماء دین سے جنہوں نے

حلقۂ دام ز محراب دعا ساختہ اند؟

ان میں کسی سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے، خود اپنے مُردہ ضمیر سے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:-

تہنیت جز بہر مصیبت در طریق ما ست ننگ
عید را در شہر ما رسم مبارکباد نیست!

آئندہ جولائی کا خاص نمبر

بعض اہم مقالات جن کا ایک ہی قسط میں شایع کرنا مناسب ہے، جولائی کے نگار میں شایع کئے جائیں گے اور اس طرح یہ نمبر ایک خصوصی نمبر کی حیثیت کا ہوگا۔

اس میں دو مقالے جناب مالک رام کے ہوں گے۔ (۱) گلِ رعنا، جو غالب کا خود انتخاب کیا ہوا فارسی کلام ہے۔ یہ مخطوطہ نایاب ہے اور اسی کو مالک رام صاحب نے ایڈٹ کیا ہے، جس سے غالب کے بعض متداول اشعار فارسی کی بھی تصحیح ہو جاتی ہے۔ (۲) غالب کی فارسی تصانیف پر اور اس میں اس کی تمام تصانیف نثر و نظم کا جایزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا مقالہ اداریہ کا عنوان "عساکر اسلامی کا نظام" ہے۔ اس کے خاص خاص عنوانات یہ ہیں :-

(۱) عساکر اسلام عہدِ نبوی و عہدِ خلفاء راشدین میں۔ (۳) عہد امویین و عباسیین و ممالک مصر کا فوجی نظام۔ (۳) فوجی دفاتر (۴) فوجی تنخواہیں۔ (۵) فوجی وظایف و عطیات۔ (۶) فوج کی تعداد۔ (۷) فوجی تنظیم۔ (۸) فوجی چھاؤنیاں۔ (۹) اسلامی جھنڈے اور پرچم۔ (۱۰) فوجی موسیقی۔ (۱۱) تفصیل اسلحہ۔ (۱۲) آلات محاصرہ۔ (۱۳) اختراع بارود۔ (۱۴) اختراع توپ (۱۵) فوج کی ترتیب اور اس کے عہدہ دار۔ (۱۶) نعرۂ جنگ۔ (۱۷) قلعہ بندیاں۔ (۱۸) بحری بیڑے۔ (۱۹) جہازوں کی قسمیں۔ (۲۰) اسلحہ سازی کے کارخانے وغیرہ وغیرہ۔

میرا سفر پاکستان

میں مئی کا پرچہ شایع کر کے کراچی جانا چاہتا ہوں۔ پندرہ بیس دن قیام کا ارادہ ہے۔ میری غیر حاضری میں دفتر نگار بند نہیں ہوگا اور تعمیل خطوط برابر ہوتی رہے گی۔ میرے نجی خطوط البتہ محفوظ رہیں گے اور ان کا جواب میں وہاں سے لوٹ کر دوں گا۔

میرا پتہ وہاں کا یہ ہوگا :-

H-9/12 Block. II
Nazimabad. Karachi.

تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور اُن کی تاریخی و مذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی، چنانچہ فاضل مولف نے اپنی کتاب کو اسی عہد سے شروع کیا ہے اور ویدی لٹریچر سے متعلق تاریخی، مذہبی، اخلاقی اور رواجی کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے نہایت وضاحت و سلاست کے ساتھ پیش نہ کیا ہو۔

یہ سلسلۂ تحقیق کتھوں نے مستشرقین مغرب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ بحثوں کے ترجمہ میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اصل عبارت کا کوئی لفظ ترک نہ ہونے پائے۔ اس کتاب میں جو زبان اختیار کی ہے وہ بہت سلیس، آسان اور عام فہم ہے۔

یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اُردو زبان میں یقیناً یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو اس خاص موضوع پر اس قدر احتیاط و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہو۔

قیمت چھ روپے (للعہ)

مینیجر نگار لکھنؤ

تصوف —— مولانا آزاد کی نظر میں

(رفیع اللہ عنایتی، رام پور)

مولانا آزاد جامع کمالات علم ظاہری و باطنی تھے۔ انھوں نے تصوف کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ دولت انھیں دو ھیال و ننھیال کی طرف سے ورثہ میں ملی تھی۔ لیکن وہ اس کے ظاہری روپ سے متنفر تھے۔ جب وہ تقریباً پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تو علم و فہم کی آیندہ منزلیں طے کیں۔ علوم مشرقیہ کی کوئی راہ ایسی نہیں جو انھوں نے طے نہ کی ہو۔ صوفیہ کے حکیمانہ اور فلسفیانہ افکار کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ سارے افکار ان کی فکر کا جزو بن گئے۔ انھیں کی مدد سے انھوں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس میں تجدید کا کام کیا۔ صوفیہ کی اسپرٹ کو اپنی فہم کا جزو بنایا۔ جس نے ان کو اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم بنا دیا تھا۔

مولانا نے تصوف کی عالمگیر روح کو قرآنی تعلیمات میں تلاش کیا ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کا حقیقی سرچشمہ بھی قرآن حکیم ہی کو ٹھہرایا ہے یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ صوفیہ کی ساری تعلیمات قرآن ہی کی تعلیمات کا پرتو تھیں۔ جن کا وہ ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ جس قدر قرآن کی تعلیمات دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے مختلف ہیں اسی طرح اسلامی صوفیہ بھی دوسرے صوفیہ سے مختلف ہیں۔ وہ ہندو جوگیوں، جینیوں، نصرانی راہبوں اور یہودیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کا طرز عمل اور طریقۂ عبادات بھی ان سب سے مختلف ہے۔ انھوں نے نہ ہندو جوگیوں کی طرح تکلیف و تعذیب جسمانی اختیار کی۔ نہ جینیوں کی طرح ناک، کان اور منہ کو بند رکھا۔ نہ نصرانی راہبوں کی طرح رہبانیت کو اپنایا اور نہ یہودیوں کی قربانی کی رسوم کو اختیار کیا۔ بلکہ وہ تعذیب جسمانی اور ان ریاضت ہائے شاقہ کو خلاف منشائے دین سمجھتے رہے۔ تو اسلامی تصوف کا صحیح سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے۔ اور وہی ٹھیک بھی ہے، کیونکہ قرآن دین مبین ہے۔ وہ خدا کا آخری پیغام ہے اور اسی کو اپنی ساری عبادات کی بنیاد بھی بنانا چاہئے جو بات قرآن و سنت سے تعلق نہیں رکھتی وہ شرک ہے، اور لوگوں کو اس گمراہی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ تصوف اور اس کی تعلیمات باطن سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے ان کو علم ظاہری سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ جب قرآن کی تعلیمات سادہ اور آسان ہیں تو پھر تصوف ناقابل فہم کیوں ہو۔ یہ سراسر فسق و ضلالت ہے اس نے سارے اختلافات پیدا کئے ہیں، تو اس صدی کی عقل و فہم تو ایسی لغویات کو تسلیم کرنے کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی طیار نہیں۔

صوفی کون ہیں؟ یہ اولیاء اللہ ہیں۔ یہ اللہ کے متقی اور مومن بندے ہیں، اور قرآن کی اصطلاح میں یہی "حزب اللہ" "اصحاب الجنۃ" اور "اصحاب المیمنۃ" کہلاتے ہیں۔ یہ صالح انسانوں کا گروہ ہے جو خدا کی راہ میں موت کی آرزو کرتا ہے۔ وہ کلمۂ حق کی خاطر جان دیتے، خون بہاتے اور طرح طرح کی جسمانی مشقتوں سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ صوفیہ اپنی تمام قوتوں کو اللہ کی پکار بلند کرنے اور انسانوں کو اس کی طرف بلاتے ہیں۔ یہی ہوتی ہے، وہ خدا کے پاک اور مقدس اوامر کے صحیح اور سچے ترجمان ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی دعوت دنیا کی اصلاح و فلاح و قیام انسانیت کاملہ کا سرچشمہ بن جاتی ہے، ان کی حیات دینوی و دینی، جسمانی و روحانی، ظاہری و معنوی کا میابیاں اور فتحمندیاں اٹل ہیں۔

صوفیہ ایسے عہد میں ہوتے ہیں جبکہ حق و سچائی محدود اور فساد و گمراہی عام ہوتی ہے۔ اس قسم کی سماج میں وہ آنکھ کھولتے اور پرورش پاتے ہیں۔ ان کے سامنے ہر طرف گمراہی و ضلالت ہوتی ہے، لیکن اسی گمراہی کی اندھیاری میں خدا کا نام نمودار ہوتا ہے

جوان کو اس سے نکال کر حق و ہدایت کے اُجالے میں لے آتا ہے، یہ قوائے الٰہیہ کو اپنا مولا اور آقا بناتے ہیں اور لوگوں کو بھی صراط مستقیم پر ڈالتے ہیں۔ مولانا نے اس جماعت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر بڑی اچھی بات کہی ہے، لکھتے ہیں :- "ہر مومن صادق جس نے شیطانی قویٰ سے اپنے تئیں الگ کر لیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کے اولیاء اور دوستوں میں شامل ہو جاتا ہے" مولانا نے اس کو ایک عمومی رنگ دیا ہے۔ جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ ان کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ وہ ابدی سچائیوں کا قالب اختیار کر لیتی ہیں، اور جن پر زیادہ سے زیادہ انسان متفق ہو سکتے ہیں۔

ہمارے زمانہ میں ارتقائے جسمانی کے بہت سے نظریات ہیں۔ ڈارون کا نظریہ بھی ہے، لیکن ان سب کے نزدیک ارتقاء انسان تک آکر رک جاتا ہے، یہ ان کی انتہا ہے۔ لیکن قرآن ہم بتلاتا ہے کہ انسانیت کے مرتبہ تک پہونچنے تک ارتقائے جسمانی ختم ہو جاتا ہے لیکن "ارتقائے روحانی" کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ارتقائے روحانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان و ایقان ترقی کرے اور اللہ کی ولایت اور دوستی اپنے اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہو جائے۔ انسانیت کی بنیاد اور تکمیل "کلمہ الطیب" اور "عمل صالح" ہیں۔ ارتقائے روحانی "صالحیت" کے درجہ سے شروع ہو کر "صداقت" اور "شہادت" سے گزر کر مقام نبوت تک پہونچتا ہے یہ اس کی انتہا ہے، صوفیہ جس قدر اعمال حسنہ اور تزکیۂ نفس و اتقاء میں ترقی کرتے ہیں اسی قدر مقام نبوت کے انوار و تجلیات سے بہرہ اندوز ہوتے جاتے ہیں، تو اس طرح روحانی ارتقاء ہوتا ہے۔

ہمارے سامنے سب سے بڑے صوفی غار حراء کے گوشہ نشین کی مثال ہے۔ اس کی زندگی کو ہمیں نمونہ بھی بنانا چاہئے مولانا نے ایک مقام پر اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :- وہ شب کیا عجیب شب تھی! دُنیا عصیاں و حق ناشناسی کی تاریکی میں مبتلا تھی، دیو باطل کا تمام عالم پر استیلا تھا، توحید کا چہرۂ نورانی کفر و شرک کی ظلمت میں محجوب تھا، نیکیاں بدیوں سے شکست کھا چکی تھیں دنیا کی تمام متمدن اور زبردست قومیں، قوت الٰہی سے بغاوت کا اعلان کر چکی تھیں، ایک نحیف و ضعیف قوم بحر احمر کے کنارے کے ریگستانوں میں، غفلت و جہالت کے بستروں پر پڑی سو رہی تھی، لیکن اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ایک گوشہ تھا، وہ گوشہ غار حراء کا گوشہ تھا، اس تفاوت و طغیان عالم میں ایک شے تھی جو قوت الٰہی کے آگے اطاعت و تسلیم کے ساتھ سربسجود تھی، وہ عزلت نشین حراء کی جبین مبارک تھی، اور ایک ہی قلب تھا جو بیدار تھا، اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اقدس تھا" تو ہمارے سامنے نبی کریمؐ کی زندگی ایک نمونہ ہونی چاہئے۔ ان سے بڑا کون صوفی اور ولی ہو سکتا ہے۔ وہ انسان کامل تھے۔ نسل انسانی صدیوں سے جس کے انتظار میں تھی ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندو ہے ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان بھی اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کر سکتا ہے۔ مولانا نے ایک مقام پر اس بات کو اس طرح ظاہر کیا ہے :- "تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں، اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے، اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اسی سرزمین کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں" تو آزاد ہندوستان میں ہمارا فریضہ ہے کہ شاہ معین الدین، حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کو زندہ کریں اور ان کی شخصیات کو نمونہ بنا کر کام کریں۔ وہ صداقت، حق پرستی اور صبر جو مجدد الف ثانی میں تھا اور جس سے

جہانگیر کا تخت لرزاں برانداز تھا اپنے اندر پیدا کریں، صوفیہ کی تعلیمات سراسر انسانی اشتراک، رواداری، انسان دوستی اور انسانوں کی خدمت تھی، اس کو پھر سے تازہ کریں، تاکہ مادی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانیوں کے اتحاد میں استحکام آئے اور مادی ترقی کا انحصار بھی اسی پر ہے کہ ہم سب مل کر اور سر جوڑ کر کام کریں۔ صوفیہ نے احترام آدمی کا درس دیا۔ یہ ان کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ قرآن کی تعلیمات انسانی مساوات کا سبق دیتی ہیں۔ صوفیہ نے قرآن کے اس پیغام کو اپنے عمل سے ثابت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ ہندو ان کے عقیدت مند ہیں۔ انھوں نے ایسے تاریک دور میں ہندوستان میں کام کیا جب کسی طرف بھی نور ایمان کی کوئی کرن پھوٹتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ ہر طرف کفر و ظلمت چھائی ہوئی تھی، نہ تعلیم عام تھی، لیکن پھر بھی ان کی تعلیم نے لوگوں پر اثر کیا۔ ان کی اعلیٰ و ارفع شخصیات سے لوگ متاثر ہوئے، وہ صحیح معنوں میں اشتراکی تھے، تو ان کی تعلیمات کی روح کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے تاکہ اشتراکی نظام کے ظاہری ڈھانچے میں روح پڑ سکے، اور ہندوستان ترقی کے منازل جلد از جلد طے، تو ہر جگہ مولانا کی تحریر و تقریر میں ہم کو صوفیہ کی تعلیمی روح نظر آتی ہے۔ جس کی مدد سے انھوں نے "متحدہ قومیت" کا سانچہ تیار کیا ہے۔ سب سے پہلے کانگریس کی تاریخ میں مولانا نے الہلال کے ذریعہ اس قسم کی تعلیم دی، جس کا نتیجہ سوراج اور خلافت تحریک کی صورت میں نمودار ہوا۔ پھر اس نے اپنی باقی منزلیں طے کیں اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوگیا۔ دراصل سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں صوفیہ نے اس قسم کی تعلیم دی تھی۔ انھوں نے انسانی مساوات، رواداری، باہمی اشتراک، اور انسان دوستی کا درس دیا تھا اور ایک ایسی زبان میں خطاب کیا جو بعد میں ہندوستانی زبان بن گئی۔ یہ بھی انھیں کا کارنامہ ہے۔ تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ صوفیہ کی تعلیمات کو جن کی "تمدنی" اہمیت ہے اپنی فکر و عمل کا جزو بنائیں تاکہ ہندوستان کی نئی سماجی عمارت ان کی تعلیمات کا بہترین مظہر ہو، جب ہی ہندوستان ترقی کر سکتا ہے۔ اس ملک کی سامری فلاح و سعادت اسی میں ہے کہ مادی ترقی کے ساتھ تصوف کی روح کو بھی اپنائیں۔

آج اسی بات کی ضرورت ہے کہ صوفیہ کے سلسلوں میں تجدید کی جائے اور جو کام مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اپنے زمانہ میں کیا تھا وہی آج بھی ہونا چاہیئے، مولانا بھی اس کے خواہش مند تھے۔ "نقش آزاد" میں مولانا نے خواجہ حسن نظامی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اسی بات پر زور دیا ہے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ نے بڑا اہم کام کیا ہے، صوفیہ کا سب سے بڑا سلسلہ ہے لیکن اس میں اس قدر خرابیاں آگئی ہیں جن کو دور کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ یہ سلسلے دینی تعلیم کی ترویج اور سماج کو بہتر بنانے کا کام انجام دے سکیں۔ ہم ایک مجدد کے آرزو مند ہیں جو شیخ احمد سرہندی کی طرح ان سلسلوں کی نئے سرے سے تنظیم کرے مولانا نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کئے۔ قرآن کی تعلیمات کو عام کیا۔ ملکی سیاست میں حصہ لے کر اس کو آزاد کرایا۔ مسلمانوں کو راہِ حق دکھانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی ایک ایسی شخصیت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے جو صوفیہ کے سلسلوں میں تنظیم و تجدید کا کام انجام دے سکے۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اسلام کی اور ہندوستان کی۔ وہی صحیح معنوں میں مجدد بھی کہلائے گا۔ ہندوستان کا خمیر تصوف کی تعلیمات سے اٹھا ہے۔ ویدوں سے اسلام تک اور پھر اسلام کے متصوفین نے اسی کام کو انجام دیا ہے یہ ادارے ضرور محفوظ ہونے چاہیئے۔ لیکن اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے زمانہ میں جماعت اسلامی نے دینی اصلاح کا کام شروع کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی راہ بالکل مختلف ہوگئی۔ اسی نے تصوف کی تاریخی اہمیت اور اس کی ماہیت سے یکسر انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے دین کو فایدہ پہونچنے کے بجائے نقصان پہونچا اور اس نے اپنا اثر بھی کھو دیا۔ مسلمانوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ جب کوئی دینی کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو پہلے بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیتا ہے اور اپنی کم سوادی اور تاریخی علم کے فقدان کی وجہ سے دین کی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مولانا مودودی نے امام غزالی اور شاہ ولی اللہ پر تجدید احیائے دین میں ایسے حملے کئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ان کو ان مذہبی اداروں کی ماہیت کا صحیح علم نہیں، یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے دین کے ستون کا کام انجام دیا ہے۔ علماء درباروں میں بند رہے۔ بادشاہوں کے اشاروں پر کام کرتے رہے۔ لیکن

صوفیہ نے اپنا مرکز عوام کی جھونپڑیوں کو بنایا۔ ان کو اپنی روحانی قندیلوں سے روشن و منور کیا۔ ہمارے تہذیب و تمدن پر تصوف کی ایسی زبردست چھاپ ہے کہ جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ تو ان ساری باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے تصوف کے مختلف سلسلوں میں اصلاح و تجدید کا کام کرنا چاہئے۔ خانقاہیں بداعمالیوں کے مرکز ہیں، بزرگوں کے مزاروں پر طوائفیں رقص کرتی ہیں۔ جن سے نفس پرست لطف اندوز ہوتے ہیں، اور ایسی ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں جن سے سر ندامت کے مارے جھک جاتا ہے۔ سجادہ نشین مزاروں کو اپنی روزی کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تو ان ساری باتوں کا دور ہونا چاہئے۔ صوفیہ ان باتوں کو کبھی بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہاں ان میں سے بہت سے سمع کو ایک مقدس چیز تصور کرتے تھے لیکن ان کی مجلسوں کا اہتمام ایک خاص طرز پر ہوتا تھا۔ سمع ذکر الٰہی میں مصروف رہ سکنے کے لئے تھا تفریح طبع کے لئے نہیں، ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دینی تعلیمات کو دیسی روپ میں پیش کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات نے عام مقبولیت حاصل کی۔ تو ان ساری باتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ کام آسان نہیں یہ وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کا دینی علم بے پایاں ہو، ایسا شخص ہی مجدد ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح مولانا کی تجویز پر مشرق و مغرب کے فلسفہ کی تاریخ رادھا کرشنن کی زیر نگرانی لکھی گئی، اسی طرح تصوف کی بھی تاریخ لکھی جانی چاہئے۔ جس طرح فلسفہ کا سب سے قدیمی مرکز ہندوستان رہا ہے اور جب فلسفہ اپنے عروج کو پہونچ چکا تھا تو یونان وغیرہ میں اس کی ابتدا ہوئی۔ تو ہم کو تصوف جس کا سب سے بنیادی تصور "وحدت الوجود" کا عقیدہ ہے اس کا اس کا سب سے قدیمی سرچشمہ بھی ہندوستان ہی ہے اور وہ وید ہیں۔ تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نہ صرف تصوف کے اسلامی سلسلوں کی نئے سرے سے تنظیم کریں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں جتنے سلسلے بھی ملتے ہیں ان کی نئے سرے سے تنظیم کریں اور اس طرح تصوف کے اداروں کے ذریعہ تصوف کی اعلیٰ تعلیمات کی ترویج کریں، تاکہ ہندوستان اپنی تاریخی عظمت کو حاصل کرلے۔ اور ساری دنیا کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں اور ایسی جاندار تہذیب فروغ پائے جس پر دنیا فخر کرسکے، تو اس میں "انسانیت" کو مدنظر رکھنا ہوگا، اور تفریق کے پردوں کو کیسر اٹھا دینا ہوگا، ہم سب انسان ہیں اور خدا کی اس سرزمین پر اس کی نعمتوں کے سچے وارث ہیں۔ اگر ہم نبی کریمؐ کے آخری خطبہ کا بغور مطالعہ کریں تو ہم کو اس میں تصوف کی پوری تعلیمات ملیں گی، وہ ایک حیثیت سے قرآنی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس میں رنگ و نسل کی تفریق کو اٹھانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں جن انسانی حقوق پر زور جس انداز میں دیا گیا ہے وہ سارے زمانہ کے لٹریچر کا پیش لفظ ہے، یو این او کے چارٹر کا انسانی حقوق کا باب سرکار دو عالم کے اس خطبہ کی کچھ جھلکیاں اپنے اندر رکھتا ہے، اس طرح ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ مذہب کے سارے صحیفوں کو اپنے سامنے رکھیں اور پھر تعصب اور تنگ نظری سے گزر کر ان کی ساری چیزوں کی نئے سرے سے تدوین کریں، ہر مذہب میں سچائیاں ملتی ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے انداز پر صداقت اور حق کی تلاش کرتے ہیں، اس لئے سب کو اب آزاد ہندوستان میں ایک جگہ جمع ہونا چاہئے تاکہ دین کی بکھری ہوئی روشنیاں ایک ساتھ جمع ہوسکیں، اور ہم انسانیت کی صالح منزلیں طے کریں۔

اس ملک کے سارے علمائے ظاہری و باطنی سر جوڑ کر بیٹھیں اور ویدوں سے آج تک کے لٹریچر کو جمع کریں، خانقاہوں اور صوفیہ کی عبادت گاہوں پر جائیں اور ان کو دیکھیں اور ساری خوبیوں اور عیوب کا مطالعہ و مشاہدہ کریں۔ پھر ملک میں صوفیہ کی جتنی تحریکیں بھی اٹھی ہیں ان سے متعلق لٹریچر فراہم کریں اور ان کے سجادہ نشینوں سے زبانی جاکر دریافت کریں۔ قدیمی عمارتوں کا مطالعہ کریں۔ اس طرح مواد جمع کرکے ان سلسلوں کی تنظیم کریں، عوام کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کا یہ ایک بہت بڑا ذریعہ ہے ہندوستان کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ عوام میں بہت سے لوگ خدمت کے کام کرتے ہیں ان سب سے ملیں۔ ان کی ہمت افزائی کریں۔ اس سلسلہ میں حکومت کو بھی کوئی قدم اٹھانا چاہئے، اور رادھا کرشنن ہی کے ذریعہ لٹریچر فراہم کرکے

یکجا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم اور فلسفی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان اس ضرورت کو محسوس کرے گا۔ لیکن میری نظر میں اس کام میں ہندو اور مسلمان کی کوئی قید نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ہندو مذہب، اسلام اور دوسرے مذاہب کو سامنے رکھنا چاہئے۔ تب ہی کوئی بڑا کام انجام پا سکتا ہے، لیکن بنیاد صحیفوں کو بنانا چاہئے۔ ویدوں اور شاستروں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہندوستان میں موجود ہے جس کا مقابلہ دنیا بھر کا مذہبی لٹریچر بھی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں گوتم بدھ کی تعلیمات کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے جس کو ہندوستان نے ماضی میں نظر انداز کر دیا تھا اور بدھ دھرم دوسرے ممالک میں فروغ پایا۔ بدھ ایک صوفی فلسفی تھا۔ مولانا نے بھی "فلسفہ" میں اس کی اسی حیثیت کو تسلیم کیا ہے تو ان سارے مذاہب کی تعلیمات کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کو صوفیہ کے سلسلوں کی نئے سرے سے تدوین کرنی ہے، یہ کام انتہائی ضروری ہے خدا کرے ہمارا ملک جلد از جلد اس طرف قدم بڑھائے۔

اغلاطِ آتش

۱۔ لعل شکر بار کا بوسہ میں کیونکر نہ لوں — کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ ہیدود کو

اصل لفظ حلوا ہے اور اضافت توصیفی میں الف کے بعد تی بڑھائی جائے گی، اس لئے حلوائے ہیدود ہونا چاہئے

۲۔ رنگ زرد و لب خشک و مژۂ خوں آلود — کشتۂ عشق ہیں ہم، یہ ہے کفارہ اپنا

صحیح لفظ کفارہ بہ تشدید فا ہے۔

۳۔ لکھے میں سرگزشتِ دل کے مضموں بکقلم اس میں — تماشہ قتل گہ کا ہے مطالع میرے دیواں کا

مطلع کی جگہ مطالع (بہ صورت جمع) بالکل غلط ہے۔

۴۔ کشاکش دم کی مار آستیں کا کام کرتی ہے — دلِ بیتاب کو پہلو میں اک گرگِ بغل پایا

گرگِ بغل فارسی میں مستعمل نہیں۔

۵۔ چار ابرو میں ترے حیراں ہیں سارے خوشنویس — کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتبِ تقدیر کا

چار ابرو سے مراد ابرو اور داڑھی مونچھ ہوتی ہے، نہ کہ صرف چہرہ (جو غالباً آتش کا مقصود ہے)

۶۔ ناخدا ہے موت جو دم ہے سو ہے بامراد — عزم ہے کشتیِ تن کو بحرِ ہستی پار کا

"بحرِ ہستی پار" بالکل لغو و مہمل ترکیب ہے۔

۷۔ جاں بخش لب کا یار کے رتبہ بلند ہے — فی الواقعی مقامِ مسیحا بلند ہے

فی الواقع ہونا چاہئے۔

۸۔ ہجر کی شب میں زلیس ہے اشتیاق روزِ وصل — رات بھر رہتیں آنکھیں انتظارِ آفتاب

انتظار بہ معنی منتظر استعمال کیا گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔

۹۔ زلف خوباں دراز لازم ہے — حال و تاہ و مختصر ہے خوب

حال کو کوتاہ کہنا لایعنی سی بات ہے اس کے علاوہ مختصر کہنے کے بعد کوہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

تصوف پر ایک نظر

ذکا صدیقی ایم۔ اے (فائنل)

۱۔ اصل کلمۂ "صوفی" ـــــ بعض کا خیال ہے کہ لفظ 'صوفی' یونانی "Sophos" سے نکلا ہے۔ مگر محض خیال ہی خیال ہے حقیقت سے دور ـــــ بعض کا کہنا ہے کہ صوفی، و 'تصوف' عربی مادہ 'صفا' سے مشتق ہیں۔ لیکن نحویین لسان عرب اس اشتقاق کو غلط بتاتے ہیں۔ اسی طرح صوفی کو "اصحاب صفہ سے منسوب" کرنا بھی صحیح نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کلمہ 'صوفی' عربی لفظ 'صوف' (اُون) سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ قرون اولیٰ میں تارک الدنیا زہاد کھردرے اُون کا جبہ یا گدڑی پہنتے تھے اس لئے ان کو صوفی یا پشمینہ پوش کہنے لگے۔ بقول جامی سب سے پہلے حضرت ہاشم کو اس نام سے پکارا گیا۔

۲۔ منشائے تصوف ـــــ منشائے تصوف کے متعلق بھی مختلف عقاید ہیں:۔

(۱) ایک قیاس تو یہ ہے کہ تصوف، سامی مذہب اسلام کے خلاف آریائی ذہن و روح کا ردِ عمل ہے۔ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت و عقاید جو آریائی نسل والوں کو مطبوع و خوش آیند نہ تھے، ان کے خلاف ردِ عمل تصوف کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ایسا قیاس کرنے والے حضرات تصوف کا سلسلہ ہندوستان کے ویدانت سے ملاتے ہیں۔ ایرانیوں کا کہنا ہے "روح ایرانی از قدیم خود استعدادِ خصوصی در تصوف داشتہ" (ڈاکٹر رضازادہ شفق) اور تصوف اسلام ایران کا عطیہ ہے۔

(۲) ازخود و مستقل:۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ عقاید تصوف ہر ملک و ہر زمانہ میں قریب قریب یکساں شکل میں پائے جاتے ہیں۔ حدوث و قدم، کون و فساد، رابطۂ خالق و مخلوق ہر ملک اور ہر زمانہ میں مفکرین کے غور و فکر کا ذکر رہا ہے اور ان سب کے نظریات ایک دوسرے سے متاثر ہوئے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں مذہب نے فلاں قوم یا مذہب سے یہ عقاید و نظریات اخذ کئے ہیں۔

(۳) تاثیر فلسفۂ نوافلاطونی:۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلاسفہ، نوشیرواں کے زمانہ میں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ انھوں نے یہاں مدرسے قایم کئے اور اپنے فلسفہ کی ترویج کی۔ یہی عقاید فلسفی بعد میں "حکمتِ اشراق" کے نام سے موصوف ہوئے وحدت الوجود، حقیقت و مجاز، عشق و مشاہدہ، عرفان و فنائے جزو و کل ان کے بعض اہم معتقدات تھے اور یہی معتقدات اسلام کے نظریۂ تصوف پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے اسی بات پر زیادہ زور دیا ہے۔

(۴) تصوف اسلامی اور قرآن و حدیث:۔ پانچویں صدی ہجری میں جب اہلِ شریعت نے حکمت اشراق اور عقاید صوفیہ پر سخت تنقید کی اور فلاسفہ و صوفیہ کی تکفیر شروع کی تو انھوں نے قرآن و حدیث سے استناد کرکے ثابت کیا کہ تصوف مین مطابق عقاید اسلامی کے ہے، بعض آیات و احادیث جن سے استناد کیا گیا ہے مندرجۂ ذیل ہیں:۔

ا۔ آیات متعلقہ معراج

ب۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

ج۔ ھو الاول والآخر والظاہر والباطن۔

د۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

ہ - اللہ نور السمٰوات والارض -
و - فاینما تولوا فثم وجہ اللہ -

وحدت الوجود اور ترک ماسوا اللہ اور دوسرے عقاید صوفیہ کے اثبات میں متعدد احادیث روایت کی جاتی ہیں، لیکن وہ قابل اعتماد نہیں -

۳ - تصوف عہد بنی امیہ میں — عہد بنی امیہ میں خلافت راشدہ کے بعد جو سیاسی نظام قایم ہوا وہ منہاج سنت پر نہ تھا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی - اس بنا پر بہت سے بزرگوں نے حکومت وقت سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ جلیل القدر صحابی، ائمہ اہل بیت اطہار، علماء اور دوسرے دیندار لوگوں نے گوشہ گیری اختیار کر لی اور زہد و ریاضت، ترک دنیا، تزکیۂ نفس اور خشیت الٰہی کو اپنا شعار بنایا - یہی زہاد صوفیائے مابعد کے پیشرو تھے - علی الخصوص حضرت حسن بصری، رابعہ عدویہ، مالک دینار، فضیل بن عیاض اور ابراہیم ادہم بلخی -

(۲) طبقۂ دوم :- عہد بنی عباس میں عقلیات کا سیلاب جو دربار مامون الرشید سے نکلا اس نے مسلمانوں کی زندگی میں لادینی رجحانات پیدا کر دئے - دینی وجدان مفقود ہو کر اعتزال (عقل پرستی) کا دور دورہ ہوا - اس زمانہ کے صوفیہ نے عقلیت کے برخلاف عشق الٰہی پر زور دیا - حضرت بایزید بسطامی و سید الطایفہ جنید بغدادی اس دور کے جلیل القدر صوفی تھے - اب تک تصوف کا کوئی منظم نظام عقاید و تصورات نہیں تھا - اس دور میں ان عقاید و تصورات نہیں تھا - اس دور میں ان عقاید کو منظم طور پر پیش کرنے کی کوشش شروع ہوئی - اسی زمانے میں "وحدت الوجود" کا نظریہ صوفیائے کرام کے اقوال و احوال میں داخل ہوا اسی عہد میں تصوف کو شریعت اسلامی کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش شروع ہوئی اور صوفیہ کے گروہ اور حلقے اور طریقت کے اولین سلسلے وجود میں آئے -

(۳) تنظیم عقاید تصوف :- ابتداءً تصوف کا کوئی خاص نظام نہ تھا - لیکن بعد میں حضرت بایزید بسطامی اور جنید بغدادی نے اس کو فنی صورت دی اور شیخ ابوبکر کلاباذی (کتاب التعرف) شیخ ابو نصر سراج (کتاب اللمع) اور شیخ علی ہجویری (کشف المحجوب) تصوف کے بنیادی تصورات پر بڑی خوبی سے بحث کی - بارھویں صدی عیسوی کے اوایل میں حجت الاسلام حضرت امام غزالی (المنقذ من الضلال اور احیاء العلوم) نے تصوف کو ایک مستقل علمی و فنی حیثیت دی -

(۴) وحدت الوجود :- عقیدۂ "وحدت الوجود" یا "ہمہ اوست" نو افلاطونی فلاسفہ کا بنیادی عقیدہ تھا - کہتے ہیں کہ انہیں کی وساطت سے تصوف اسلامی میں ان خیالات کا نفوذ ہوا - اس عقیدہ کی اصل اور بعض اہم فروعات مندرجہ ذیل ہیں :-

ا :- ہمہ اوست ، لاموجود الا اللہ -
ب : خدا تعالےٰ ، حق ، وجود مطلق ، خیر محض ، حسن مطلق ، معشوق حقیقی -
ج : ماسوا اللہ ، آئینۂ حق نما ، مظہر حسن لایزالی اور تمثیلات جزو و کل وغیرہ
د : وجہ تخلیق عالم ، کنت کنزاً مخفی فاحببت ان اعرف -
(میں چھپا ہوا خزانہ تھا پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں)
حسن کا تقاضہ ہے کہ خود کو ظاہر کرے - اللہ، جمیل ہے، اپنے جمال کے اظہار کے لئے اس نے تخلیق دو عالم کی -
ہ : عشق و مشاہدہ، عشق مجازی "المجاز قنطرۃ الحقیقت" کے مطابق عشق حقیقی کا ذریعہ ہے اور منتہائے تصوف یعنی عرفان و اتصال اور فنا فی اللہ بقا باللہ کا وسیلہ -

(۵) **تدوین علم تصوف** :- شہاب الدین سہروردی صاحب حکمت الاشراق نے فلسفۂ نو افلاطونی کی ترویج کی اور اس کی بنیاد پر شیخ اکبر محی الدین ابن العربی نے اپنی تصانیف "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" میں وحدت الوجودی عقاید کو تصوف میں مستقل حیثیت دے دی۔ فصوص الحکم کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ خاص خاص شرحیں یہ ہیں :-

ا - شیخ صدرالدین قونوی :- النصوص اور فکوک

ب - شیخ فخرالدین عراقی :- لمعات

ج - جامی :- اشعۃ اللمعات

(۶) **مخالفت متشرعین وفقہاء** — اقوال و اعمال صوفیہ میں مختلف ذرائع سے آئے ہوئے گوناگوں عقاید و خیالات جاگزیں ہو گئے تھے اور اس طرح اس میں وسیع المشربی اور آزاد خیالی زیادہ پائی جاتی تھی۔ لیکن علماء ظواہر صوفیہ کے اقوال و اعمال کی اس آزادی کو شعار اسلام کے منافی سمجھتے تھے، وحدت الوجود کو ماننے والے صوفیہ کا عقیدہ تھا کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اہل ظاہر اس کے مخالف تھے اس لئے انھوں نے صوفیہ پر کفر و الحاد اور زندقہ کا الزام لگایا ان کے رد میں کتابیں لکھیں۔ جن میں علامہ ابن جوزی کی تلبیس ابلیس اور امام ابن تیمیہ کے رسایل بہت مشہور ہیں۔ علمائے ظاہر ہی میں سے کسی کا مشہور قول ہے کہ:- "محی الدین ابن العربی گنبدِ الحاد ساختہ بود و جامی آں را نقش و نگار بست" اہل تشیع بھی تصوف کے سخت مخالف ہیں۔ مثنوی مولوی معنوی جسے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے اس کے متعلق اپنی مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے ایک شیعہ شاعر کہتا ہے :-

این کلام صوفیان شوم نیست مثنوی مولوی رومی نیست

(۷) **وحدت الشہود** — ہندوستان میں عہد اکبری و جہانگیری میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے "وحدت الشہود" یا "ہمہ از اوست" کا نظریہ پیش کیا اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی تاسیس کی۔

(۸) **اعمال و اشغال صوفیاء** — صوفیۂ کرام نے کشف و علم باطن حاصل کرنے اور فنا فی اللہ و بقا باللہ کے منتہا تک پہونچنے کے لئے مکمل طریقۂ اذکار و اشغال اختیار کیا۔ جس کو سیر و سلوک کہتے ہیں۔ سالک کے لئے مقام و حال کے مدارج مقرر کئے اور مجاہدہ و ریاضت اور اذکار و اشغال کا پورا نصاب مرتب کیا اور علم باطن سکھانے کے لئے مختلف ممالک اسلامی اور مختلف زمانوں میں متعدد سلسلے قایم ہوئے :-

(ا) سہروردیہ :- جس کے موسس اول حضرت شیخ زکریا ملتانی تھے۔

(ب) قادریہ :- اس کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد شریف میں اور حضرت عبدالقادر سامی اوچہ (سندھ) میں تھے

(ج) چشتیہ :- اس کی بنیاد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی۔

(د) نقشبندیہ :- اس کے بانی حضرت خواجہ باقی باللہ اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

(۹) **تصوف و نغمہ و شعر** — عقیدۂ وحدت الوجود کے بعد ہی حسن مطلق، عشق الٰہی، ذوق و شوق اور وجد و حال کے تصورات نے تصوف میں نفوذ کیا اور چونکہ ذوق و شوق پیدا کرنے میں نغمہ تاثیر عظیم رکھتا ہے۔ اس لئے اکثر صوفیہ نے تحلل سماع اختیار کیا۔ فاتحہ حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کا مشہور قول ہے کہ:- "من روزِ میثاق دعوتِ حق را در لحن پوربی شنیدہ بودم" — حضرت امیر خسرو اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں ؎

آں روز کہ روح پاک آدم ؛ بدن گفتند در آنمی شد از ترس بدن

خواندند ملائکہ ؛ لحن داؤد در تن در تن در آور آور تن در تن

تصوف کے متعلق ایک مشہور قول ہے کہ " برائے شعر گفتن خوب است " - حسن و عشق کے نظریات جو سرتاسر شاعرانہ تھے صوفیہ کے کلام میں اشعار عرفانی کی صورت میں جلوہ گر ہوئے اور تعبیرات و استعارات و کنایاتِ عشق مجازی نے عشق حقیقی کے بیان کو بڑی وجد آفریں کیفیت عطا کی -

سب سے پہلے رباعی گو شعراء نے اپنی رباعیوں میں تصوف کے مضامین بیان کئے جن میں بابا طاہر عریاں کی دو بیتیاں ، شیخ عبداللہ انصاری ، سلطان ابوسعید ابوالخیر اور سرمد شہید کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

مثنوی میں سنائی و عطار نے ابتدا کی اور مولانا روم نے اپنی مثنوی کے چھ دفتر لکھ کر ایک دائرۃ المعارف تصوف کا مرتب کر دیا غزل میں عشق حقیقی کا جوش و خروش عطار اور مولانا روم کی غزلوں سے شروع ہوا ، عراقی نے اس کی تقلید کی اور حافظ نے منتہاء کمال تک پہونچا دیا -

---

کائنات کی وسعت

بطلیموس نے اپنی تصنیف میں جو علم ہیئت کا غالباً اولین صحیفہ ہے کل ۱۰۲۲ ستاروں کا محل وقوع بتایا ہے مگر یہ آج سے تقریباً اٹھارہ صدی پہلے کی بات ہے لیکن اب نظام شمسی کے بارے میں ہماری معلومات بہت ترقی کر گئی ہے - یہاں تک کہ تین ہیئتی اداروں (پالومر ، نیشنل جاگرفک سوسائٹی اور کیلیفونیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی) نے اپنے ہفت سالہ پروگرام میں اب اپنے حدودِ مطالعہ کو ۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل تک بڑھانے کا ارادہ کیا ہے - اس فاصلہ کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اُن اجسام فلکی کی روشنی جو اس فاصلہ پر واقع ہیں ۱۸۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ۶۰،۰۰۰،۰۰۰ سال چل کر ہم تک پہونچی ہوگی - اس ادارہ نے اُن اجسام فلکی کا نقشہ مرتب کرنے کا بھی عزم کیا ہے جن کا صحیح شمار لگانا غیر ممکن ہے اور جن کا تعلق ہمارے نظام شمسی سے بہت آگے کی فضا سے ہے -

ہمارے پاس ایسی دوربین نہیں جو نظر کو اتنی دور واقع ہونے والے سیاروں تک پہونچا سکے اس لئے فی الحال صرف اُن سیاروں کا نقشہ مرتب کرتا ہے جو ساٹھ کروڑ نوری سال کے فاصلہ کے اندر ہیں ورنہ پالومار میں ایک دوربین ایسی بھی ہے جو ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ نوری سال کی دوری پر واقع ہونے والے سیاروں کو دیکھ سکتی ہے - اس دیو قامت دوربین کا آئینہ ۲۰۰ انچ قطر کا ہے - لیکن اس دوربین کے استعمال میں قباحت یہ ہے کہ پورے چاند کے کل ایک چوتھائی رقبہ کو دیکھ سکتی ہے اور اب ایک جرمنی شیشہ ساز برنہارٹ شمٹ نے ایک ایسا لینس وضع کیا ہے جو بیک وقت کائنات کے زیادہ سے زیادہ حصہ کا عکس لے سکے - یہ نیا سکوپ اُس کے موجد کے نام پر " شمٹ " کہلاتی ہے اور پالومر ہی میں ایک علیحدہ گنبد پر نصب ہے - اس کے لینس کا قطر ۴۸ انچ - اس دوربین سے فوٹوگرافک پلیٹ پر ایک وقت میں ۲۰۰ چاندوں کے مجموعی رقبہ کے برابر آسمان کا حصہ دیکھا جا سکتا ہے - یہ اس قدر قوی ہے کہ دس ہزار میل کے فاصلہ پر موم بتی کی روشنی کو محسوس کر سکتی ہے اور جو ستارے ہم کو بہت دھندلے نظر آتے ہیں اُن کی روشنی کے دس لاکھویں حصہ کو بھی سامنے لا سکتی ہے -

صوفی فلاسفہ

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

فلسفۂ تصوف اور اسلام

نام نہاد اسلامی فلسفہ کی طرح اسلامی تصوف کے متعلق بھی مشرق و مغرب کے محققین کی تحقیق اغلاط سے خالی نہیں، مثلاً پروفیسر براؤن نے دوسرے مورخین کی طرح یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ حضرت امام علی رضاؑ کی وفات ۲۰۳ھ (مطابق ۸۱۸ء) میں ہوئی[1] حسین بن منصور الحلاج کے متعلق بے تکلف تحریر فرما دیا کہ وہ اثنا عشریوں کے آٹھویں امام حضرت علی رضاؑ کا داعی تھا اور اسی جرم میں حلاج کو ایران میں معذب کیا گیا تھا۔ پروفیسر براؤن کے نامور شاگرد پروفیسر نکلسن نے بھی حلاج کے بارے میں اپنے استاد کی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھا ہے) حالانکہ اگر یہ دونوں حضرات حلاج کے ہمعصر علامہ طبری کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تو ان پر یہ امر واضح ہو جاتا کہ حلاج کو دعوئے ربوبیت کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا[2] اور اس کو سو برس قبل وفات پانے والے حضرت امام علی رضاؑ کی زیارت کا کوئی موقع حاصل نہ تھا۔

پروفیسر نکلسن تصوف کے بیان میں اپنے استاد سے بھی کوسوں سبق لے گئے اور انھوں نے اپنی مختلف تصانیف میں تصوف کے متعلق متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے کہیں یہ فرمایا کہ تصوف نویں صدی عیسوی سے قبل رائج نہیں ہوا تھا[3] اور کہیں یہ ارشاد ہے کہ تصوف کی ابتدا آٹھویں صدی عیسوی میں شیعی، یونانی، ناسٹک اور عیسائی افکار کے مرکز کوفہ میں ہوئی[4]۔ پھر ۱۹۲۹ء میں نظر ثانی کے بعد ایک جگہ یونانی اور شامی افکار کو تصوف کی اصل سمجھا اور دوسری جگہ نو افلاطونی، ناسٹک، عیسائی اور ہندو افکار کو تصوف کی اصل سمجھا۔

پروفیسر نکلسن کی طرح ۵۹۷ھ مطابق ۱۲۰۰ء میں وفات پانے والے علامہ ابن جوزی نے بھی صوفیہ کے متعلق اپنی مشہور تصنیف تلبیس ابلیس میں متباین خیالات کا اظہار فرمایا ہے، یعنی ایک جگہ تو ذوالنون مصری کو اتنا پابند سنت تحریر فرمایا کہ انھوں نے صلوٰۃ و حدیث کے علاوہ خطرات اور وساوس کے بارے میں گفتگو کرنے کو بھی بدعت سمجھا[5] اور دوسری جگہ ذوالنون مصری کے متعلق یہ نقل کیا کہ انھوں نے وہ علم شایع کیا جس کے بارے میں سلف نے گفتگو نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے لوگوں نے ان پر زندقے کا الزام لگایا[6]۔

---

[1] "A Literary History of Persia" Vol 4 Page 994

[2] تاریخ طبری جلد سوم حصہ سوم و چہارم مترجمہ مولانا عادی، صفحہ ۲۸۷

[3] "Studies In Islamic Mysticism" Page 11

[4] "A Literary History of the Arabs" Page 473

[5] "تلبیس ابلیس" مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی صفحہ ۱۸ — [6] حوالۂ سابق صفحہ ۲۵

نقد و بصر میں تساہل کا یہ نتیجہ ہوا کہ تصوف کی ابتدا کے متعلق درکنار صوفیہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق بھی کوئی قولِ فیصل پیش نہیں کیا جا سکا، علامہ ابن جوزی نے تلبیس ابلیس کے دسویں باب "فی ذکر تلبیس ابلیس علی الصوفیۃ" میں صوفیہ کو ایک قوم صوفہ یا اصحابِ صفہ سے منسوب کرنے کے بعد اپنا یہ قولِ راجح پیش فرماتے ہیں کہ صوفیہ غوث بن بشر سے منسوب ہیں جس کا لقب صوفہ تھا اور جس نے سب سے پہلے بیت الحرام کی خدمت کے لئے زمانۂ جاہلیت میں اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔

علامہ ابن تیمیہ نے "الصوفیۃ والفقراء" مطبوعہ مطبع المنار مصر کے صفحہ ۲ پر صوفیہ کی وجہ تسمیہ کی بحث شروع کی اور یہ تشریح کرنے کے بعد کہ اگر وہ اہلِ صفہ سے منسوب ہوتے تو انھیں صفوی کہا جاتا اور اگر وہ اولیاء اللہ کی صفِ اول سے منسوب ہوتے تو ان کو صفی کہا جاتا اور صوفۃ بن بشر سے منسوب ہونے کے قول کو ضعیف قرار دے کر آخر میں صوفیہ کے لباس الصوف یعنی اونی کپڑوں سے منسوب ہونے کے قول کو مرجح قرار دیا۔ لیکن اپنی دوسری تصنیف "الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان" کے صفحہ ۲۳ پر بھی صفوۃ الفقہاء۔ صفوۃ بن اد۔ اہل الصفۃ۔ صفا اور صفوت سے منسوب ہونے کے تمام اقوال کو ضعیف قرار دیا ہے اور لباس الصوف سے انتساب کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ "ہذا ہو الصحیح" یعنی بس یہی صحیح ہے لیکن خود متقدمین صوفیہ کو لباس الصوف سے اپنا انتساب پسند نہیں تھا اور ۴۸۰ھ میں وفات پانے والے ابوبکر بن اسحٰق الکلابادی نے اپنی مشہور تصنیف التعرف لمذہب التصوف کے دیباچے کے بعد ہی یہ بحث شروع کی کہ "لم سمیت الصوفیۃ صوفیۃ" یعنی صوفیہ کو صوفیہ کیوں کہا جاتا ہے؟ اور اس سلسلہ میں صفاء اسرار۔ صفاء قلب۔ صفاء معاملہ۔ اولیاء اللہ کی صف اول۔ اہل الصفۃ اور لباس الصوف کا ذکر کرنے کے بعد اپنا قول فیصل یہ پیش فرمایا ہے کہ چونکہ صوفیہ کی ظاہری اور باطنی وضع اصحابِ صفہ کی طرح ہے لہٰذا ان کو صوفیہ کا لقب دیا گیا[1]

مغرب کے محققین نے اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے بعد کہ عرب ایسے گرم ملک میں دو تین مہینوں کے علاوہ اونی کپڑے پہننا عقلاً ممتنع ہے، صوفی کو صوف سے مشتق سمجھا چنانچہ پروفیسر براؤن نے اس قول پر اعتماد فرما کر کہ حضرت عمر اور حضرت سلمان فارسی ہمیشہ اونی کپڑے پہنا کرتے تھے یہ رائے قائم فرمائی کہ صوفی صوف یعنی اون سے مشتق ہے[2] اور پروفیسر آربری نے ۱۹۵۰ء میں بار اول شایع ہونے والی تصنیف صوفی ازم میں اغلباً ابوبکر بن اسحٰق الکلابادی کے اس قول سے متاثر ہو کر کہ اصحابِ صفہ ہمیشہ اونی لباس استعمال کرتے تھے اور بارش اور پسینے کی وجہ سے اصحابِ صفہ کے کپڑوں سے بھیڑ کی بدبو آتی تھی[3] یہ قولِ فیصل درج فرمایا کہ صوفی یقیناً صوف سے مشتق ہے[4] حالانکہ اگر اس قول کو مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ تصوف کی ابتدا عرب یا عراق ایسے گرم ملک سے نہیں بلکہ ایران یا کسی اور سرد ملک سے ہوئی جہاں بانیانِ تصوف کے لئے عادۃً لباس الصوف استعمال کرنا ممتنع نہ تھا۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ اسلامی فلسفہ کی طرح تصوف پر بھی تحقیق کی نظر نہیں ڈالی گئی اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے عصر کے مغربی محققین بھی اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تصوف میں "آٹھویں صدی عیسوی کی پر اسرار ہستی" حسن بصری کی علمی تحریک کو بڑا دخل ہے[5] اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ولی الدین ایسے مشرقی محققین بھی یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف

---

[1] "شرح تعرف" مطبوعہ مطبع نول کشور صفحات ۲۲ - ۴۹

[2] "A Literary History of Persia" Vol 1 Page 417

[3] "شرح تعرف" مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۰

[4] "Sufism" by A. J. Arberry Page 35

[5] "Avicenna Scientist & Philosopher" Page 51

کوئی اسلامی تحریک، ہے[1] اور قرآنِ حکیم سے اتنے بے خبر ہیں کہ قرآن حکیم میں اعیانِ ثابتہ کو شاکلات سے تعبیر فرماتے ہیں[2] حالانکہ آٹھویں صدی عیسوی کی پراسرار ہستی یعنی امام حسن بصری کو علامہ ذہبی نے صلفِ صالحین کی طرح عقیدۂ جبر کا پیرو تحریر فرمایا ہے[3] اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی امام حسن بصری کے قایلِ اختیار ہونے کے روایات کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدۂ جبر کے قایل ہونے کے روایات بھی نقل کی ہیں[4]۔ رہا امام حسن بصری کا خلفاء بنی امیہ کے مظالم سے گھبرا کر گوشہ نشینی اختیار فرمانے کا افسانہ تو یہ طبری کی اس تاریخی شہادت سے باطل ہو جاتا ہے کہ جب بنی امیہ کے مشہور یزید بن عبدالملک بن مروان کے ہم نام سردار یزید بن مہلب نے اس ظلم و ستم کے خلاف اٹھائی تو امام حسن بصری نے لوگوں کو یزید بن مہلب کا ساتھ دینے سے منع کیا[5]۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ خلفاء بنی امیہ کے مظالم یا امام حسن بصری کی نیکی اور تورع[6] کا انکار کروں لیکن میں پروفیسر نکلسن کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ خلفاء بنی امیہ کے فسق و فجور اور مظالم کی وجہ سے صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام نے عزلت نشینی اختیار فرمائی۔ اسی طرح علامہ ابن خلدون کے اس خیال سے بھی میں متفق نہیں ہوں کہ خلفاء راشدین کے بعد جب رفتہ رفتہ مسلمان دنیا کی طرف جھک پڑے تو اس دور میں جن مسلمانوں نے دنیا سے اجتناب کیا انھیں کو صوفیہ اور متصوفہ کے نام سے یاد کیا گیا[7]۔

اسی طرح نہ میں پروفیسر نکلسن کی اس عجیب و غریب تحقیق سے متفق ہوں کہ چونکہ اسلام میں خدا کی محبت کا تصور نہیں ہے لہٰذا تصوف کا شیوع ہوا[8] اور نہ پروفیسر گولڈ زیہر کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ خیر القرون کے زہد نے تصوف کی شکل اختیار کی۔

جہاں تک خدا کی محبت کا تعلق ہے خود قرآنِ حکیم کی یہ شہادت موجود ہے کہ "والذین آمنوا اشد حباً للہ" (یعنی مومنین تو سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں)۔ اور جہاں تک صوفیہ کے مرعومہ زہد کا تعلق ہے سنی اور شیعی جوامعِ حدیث کے علی الرغم قرآنِ حکیم کی آیت "ووجدک عائلاً فاغنیٰ" (یعنی ہم نے تم کو تنگ دست دیکھ کر غنی بنا دیا) سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صوفیہ کی طرح تہی دست نہیں تھے اور خود پروفیسر نکلسن کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو ترجیح نہ دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلام نے دنیا سے ترکِ تعلق کا حکم دیا ہے۔ موصوف کے الفاظ ہیں اگرچہ روزے رکھنے کا حکم اور شراب کی ممانعت موجود ہے تاہم پیغمبر اسلامؐ نے یہودیوں کے ایسینی فرقے یا عیسائی راہبوں کی طرح کے زہد کا حکم کبھی نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس یہ ارشاد فرمایا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے[9]۔

سنی اور شیعی جوامعِ حدیث سے قطع نظر کے بعد تاریخ کے صفحات میں جس مسلمان زاہد کا سب سے پہلے ذکر آتا ہے وہ موسیٰ بن ہزان ہے جس کے متعلق علامہ طبری نے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے بیس سال سے پانی نہیں پیا تھا[10] اور اس کے باپ ہرمزان کے ایرانی النسل

---

[1] "History of Philosophy Estern & Western" Vol 2 Page 172
[2] Ilud Page 176
[3] "میزان الاعتدال" مطبوعۂ لکھنؤ جلد اول صفحہ ۲۱۶ — [4] "تہذیب التہذیب" مطبوعۂ حیدر آباد جلد دوم صفحہ ۲۷۰
[5] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم جلد دوم حصہ سوم صفحہ ۵۲
[6] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم جلد دوم حصہ سوم صفحات ۴۵ - ۴۴
[7] "A Literary History of the Arabs" Page
[8] Ilud Page 231
[9] "A Literary History of the Arabs" Pages 224-25
[10] تاریخ طبری مترجمۂ مولانا عمادی جلد سوم حصہ سوم و چہارم صفحہ ۲۴۷

ہونے کی وجہ سے پروفیسر براؤن کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ اکثر نام نہاد اسلامی فرقوں کے عقاید کی طرح تصوف کے عقاید کی ابتدا بھی مسلمانوں کے دور میں نہیں بلکہ ساسانیوں کے عہد میں ہوئی[1]۔

مسلمان عربوں اور ایرانیوں کے تعلقات کی ابتدا فتحِ ایران کے بعد ہوئی لیکن عربوں نے ایرانی موالی یعنی نومسلموں کو قبولِ اسلام کے بعد بھی اپنا ہمسر خیال نہیں کیا اور کم از کم امیر معاویہ اور یزید کے عہد میں ان نومسلم ایرانیوں کو سرکاری مالگذاری میں عام مسلمانوں کے برعکس کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا[2]۔

ان نومسلموں کے غیر اطمینان بخش حالت سے سب سے پہلے فایدہ اُٹھانے والے ایک عرب مختار بن ابی عبیدہ ثقفی تھے[3]۔ یزید کے مرنے کے بعد ایک طرف تو مختار نے امام حسینؑ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا ارادہ ظاہر کرکے اہلِ بیت کے عرب ہمدردوں کی ہمنوائی حاصل کی اور دوسری طرف ایرانی نومسلموں اور ایرانی غلاموں کو بنی امیہ کے بے پناہ مظالم سے نجات دلانے کا وعدہ کرکے انھیں اس حد تک اپنا گرویدہ بنالیا کہ جب کوفہ کے عرب سردار عبدالرحمٰن بن مخنف کے پاس آئے اور اُسے مختار کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا تو اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ تمھارے عمائد مختار کے شریک ہیں اور تمھارے غلام اور موالی اس کے گرویدہ ہیں۔ تمھارے غلام اور موالی تمھارے دوسرے دشمنوں کے مقابلہ میں ہم سے کہیں زیادہ شدید عداوت اور کینہ رکھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ مختار سے عرب کی شجاعت اور عجم کی عداوت سے لڑے گا[4]۔ اور عبدالرحمٰن کا یہ خیال صحیح نکلا یعنی مختار کی آٹھ ہزار فوج میں صرف سات سو عرب تھے اور باقی موالی[5]۔ مختار کے قتل کے بعد ایرانیوں کی کثیر تعداد کو قتل کردیا گیا اور باوجودیکہ مختار نے حضرت محمد حنفیہ کے منشا کے خلاف[6] موصوف کو المہدی مشہور کردیا تھا[7]۔ تاہم حضرت محمد حنفیہ یا ان کے صاحبزادے ابوہاشم کے متعلق یہ امر کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایرانیوں سے ربط ضبط رکھا ہو۔

ہاں جب سنہ ۹۸ھ میں ابوہاشم کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے محمد بن علی کو ابوہاشم کے بجائے امام مانا گیا[8] تو پھر رفتہ رفتہ عباسی ائمہ عربوں سے اتنی دور اور ایرانیوں سے اتنے قریب ہوگئے کہ انھیں محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم نے اپنے دورِ امامت میں اپنے ایک داعی عبدالرحمٰن کو سنہ ۱۲۸ھ میں یہ ہدایت کی کہ اگر ہوسکے تو خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ چھوڑنا اور جو لڑکا پانچ بالشت کا ہو اس پر بھی کوئی نہ کوئی الزام رکھ کر اُسے قتل کردینا[9] اور دوسرے داعی ابومسلم خراسانی کو یہ خط بھیجا کہ خراسان میں جتنے عربی بولنے والے ہیں ان سب کو قتل کردے[10] اور جب چار سال بعد اس ابراہیم کے باپ محمد بن علی کی سنہ ۱۰۷ھ یا سنہ ۱۰۸ھ[11] کی اس ایرانی تحریک نے بنی امیہ کا خاتمہ کیا اور مروان الحمار کے مشہور گورنر نصر بن سیار نے درجِ ذیل شعر میں اس

---

[1] "A Literary History of Persia" vol 1

[2] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۶۳ - [3] تاریخ طبری مترجمہ محمد ابراہیم جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۶۵

[4] "A Literary History of Persia" Vol 1 Page 229

[5] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم جلد سوم حصہ دوم صفحہ ۲۱

[6] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۳۲

[7] "فلسفۂ اسلام" مصنفۂ ادلیری مترجمۂ احسان احمد صفحہ ۷۸

[8] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم، جلد دوم حصہ سوم، صفحہ ۴۸۵

[9] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم، جلد سوم، حصہ اول، صفحہ ۲

[10] تاریخ طبری مترجمۂ محمد ابراہیم، جلد دوم، حصہ سوم و چہارم صفحات ۲۷ - ۱۲۶ - [11] حوالۂ سابق صفحہ ۱۲۸

تلخ حقیقت کا اظہار کیا کہ بنی امیہ کے آخری تاجدار کی رخصت اور بنی عباس کی کامیابی حقیقۃً عربوں اور اسلام کی تباہی ہے۔[1] "فقری عن رحلک ثم قولی - علی الاسلام والعرب سلام" تو ابراہیم بن محمد کے دونوں بھائی ابوالعباس السفاح اور ابوجعفر المنصور خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بننے کے باوجود ایرانیوں کے امام بھی باقی رہے اور اگرچہ "الملک عقیم" کے تحت ان کو ابومسلمی اور ابومسلم کو بھی قتل کرنا پڑا اور اپنے ان ایرانی شیعوں کو بھی تہ تیغ کرنا پڑا جنھوں نے ابوجعفر المنصور کے دارالخلافت میں اس کو علی الاعلان خدا کہنا شروع کر دیا تھا۔[2] تاہم ابوجعفر المنصور ہمیشہ اہل خراسان یعنی ایرانیوں کو اپنا حقیقی بہی خواہ سمجھتا رہا اور اپنے جانشین المہدی کو یہ وصیت کی کہ اہل خراسان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آنا کیونکہ یہی تمہارے شیعہ اور شریک کار ہیں ان کے خدمات کا صلہ دینا ان کی خطا سے درگزر کرنا اور جب ان میں سے کوئی مرجائے تو اس کی جگہ اسی کی اولاد یا عزیز کو مقرر کرنا۔[3]

بہرنہج اس میں کوئی کلام نہیں کہ انسان کو خدا کا مظہر سمجھنے کا عقیدہ جو مشہور صوفی شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کی تصانیف میں "الانسان الکامل" کی صورت سے نمودار ہوا[4] اور جس کی رو سے عبدالکریم بن ابراہیم الجیلانی نے نہ صرف یہ مانا کہ حضرت محمد مصطفیٰ عقل اول اور حضرت جبریلؑ کے باپ ہیں۔[5] بلکہ یہ بھی تسلیم کیا کہ انسان کامل یعنی حضرت محمد مصطفیٰ کبھی شبلی کی صورت میں دنیا میں تشریف لائے اور شبلی کے مریدوں نے شبلی کو رسول اللہ سمجھا اور کبھی عبدالکریم الجیلانی کے شیخ کی شکل میں دنیا میں تشریف فرما ہوئے۔[6] حقیقۃً غیر عربی اور غیر اسلامی ہے اور بنی عباس کے ان ایرانی شیعوں کی جدت طبع کا نتیجہ ہے جو اسلام سے قبل اپنے بادشاہوں کو خدا یا نیم الٰہ سمجھتے تھے۔[7]

لیکن تصوف صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ کسی خاص انسان کو خدا کا مظہر سمجھ لیا جائے بلکہ تصوف کا مابہ الامتیاز عقیدۂ وحدۃ الوجود ہے اور مجھے اس بارۂ خاص میں مغرب[8] اور مشرق[9] کے محققین کی اس رائے سے سخت اختلاف ہے کہ عقیدۂ وحدۃ الوجود ابویزید بسطامی اور جنید کی وجہ سے تصوف میں داخل ہوا۔ (باقی)

---

[1] "A Literary History of Persia" Vol 1 Page 265

[2] تاریخ طبری مترجمہ محمد ابراہیم جلد سوم، حصہ اول صفحہ ۱۱۳

[3] تاریخ طبری مترجمہ محمد ابراہیم جلد سوم حصہ اول صفحات ۲۷-۴۲۶

[4] "A Literary History of the Arabs" Page

[5] "الانسان الکامل" الجزء الثانی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹

[6] حوالۂ سابق صفحہ ۴۸

[7] "تاریخ ادبیات ایران در عصر جدید" مصنفہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن - مترجمہ وہاج الدین احمد شایع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی صفحہ ۲۹

[8] "A Literary History of Persia" Vol I Page 426-27

[9] "تاریخ فلاسفۃ الاسلام" صفحہ ۳۰۹ -

عورت اور اسلام

جناب مالک رام ایم - اے کی مشہور تصنیف، جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔

قیمت تین روپے علاوہ محصول -

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوؤں کا موقف

مُسلم حکومتوں کے زمانہ میں

(نیاز فتحپوری)

ہندو مسلم تفریق اس میں شک نہیں مذہبی تفریق ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ دینی اختلاف جامعۂ بشریت کے انتشار و افتراق کو بھی مستلزم ہو۔ مذہب کا تعلق بالکل انفرادی جذبات سے ہے اور انسان کے اجتماعی و تمدنی تعلقات کو اس سے متاثر نہ ہونا چاہئے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ لڑائیاں اختلاف مذہب ہی کی وجہ سے ہوئیں اور قومی تعلقات بھی اسی دینی اختلاف نے خراب کئے۔

اس کے کیا اسباب تھے اور مذہب جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصود ہی انسانیت پرستی ہے، کیوں اس نے انسانیت دشمنی اختیار کرلی؟۔ اس کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں، جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ہمارا مقصود نہیں۔

فی الحال ہم کو صرف ہندوستان اور یہاں کے ہندو مسلم تعلقات کو دیکھنا ہے کہ وہ کیوں اس قدر خراب ہوگئے کہ مجبوراً ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا پڑا اور اس تقسیم کے بعد بھی تعلقات خوشگوار نہ ہوسکے۔

کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب برطانوی حکومت تھی، جس نے ان دونوں قوموں کا مل کر رہنا کبھی پسند نہ کیا اور ان کے ذہن کو مسموم کرنے کے لئے تاریخی واقعات مسخ کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔

چونکہ برطانوی حکومت، مسلم حکومت کے بعد شروع ہوئی تھی اس لئے اس نے سب سے زیادہ کوشش یہی کی کہ جانے والی سلطنت کے خلاف ہندوؤں میں جذبات نفرت پیدا کئے جائیں اور ہندو مسلم تعلقات خراب کرکے ان کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا جائے۔

اس سلسلہ میں اس نے سب سے زیادہ کامیاب چال یہ اختیار کی کہ تاریخ کو مسخ کرنا شروع کیا تاکہ پوری نسل اس سے متاثر ہو اور ہمیشہ کے لئے ہندو کو مسلمانوں سے متنفر کردیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے تاریخ کی کتابوں میں زیادہ زور اسی پر زور دیا کہ مسلم فرمانروا بڑے متعصب تھے، بت شکن تھے، انھوں نے ہندوؤں سے بہت برا سلوک کیا اور ان کی مذہبی آزادی چھین لی، حالانکہ یہ سب کچھ حقیقت کے خلاف تھا اور ہندوؤں نے بھی بغیر تصدیق اس کو صحیح سمجھ لیا۔

اس سلسلہ میں چند تاریخی حقایق ملاحظہ ہوں:-

(۱)

جب راجہ داہر کے عہد میں سواحل سندھ پر بحری قزاقوں کی تاخت نے بحری سفر کو خطرناک بنادیا اور عراق کے جہاز بھی حملے ہونے لگے تو حجاج بن یوسف، عامل عراق نے راجہ داہر فرمانروائے سندھ کو اس بدامنی کے انسداد کی طرف متوجہ کیا، جب راجہ داہر نے باوجود بار بار یاد دہانی کے اس طرف کوئی توجہ نہ کی تو حجاج نے عربوں کی بحری تجارت کے تحفظ کے خیال سے محمد قاسم کو سندھ روانہ کیا۔

یہ تھا اصل سبب سندھ پر مسلمانوں کے حملہ کا، لیکن جب محمد قاسم کا اس علاقہ پر اقتدار قایم ہوگیا تو اس نے کیا کیا؟
اس وقت یہاں بودھ مذہب رائج تھا اور جب محمد قاسم نے دیبل (موجودہ کراچی) فتح کیا تو یہاں کے ایک ہزار پوجاریوں نے استدعا کی کہ انھیں اپنے مذہبی مراسم پر قایم رہنے کی اجازت دی جائے اور اس کی اجازت انھیں دیدی گئی، چنانچہ وہ بدستور صبح اُٹھ کر کاسۂ گدائی لئے ہوئے بھیک مانگا کرتے۔ محمد قاسم نے صرف یہی نہیں کیا، بلکہ عام اجازت دیدی کہ جو عبادتگاہیں دورانِ جنگ میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں ان کی مرمت کرائیں، آزادی کے ساتھ پوجا پاٹ کریں اور اسی کے ساتھ ملک کی آمدنی کا تین فیصدی جو پوجاریوں کا حق تھا، بدستور بحال رکھا، اور اس کا سارا حساب کتاب برہمنوں ہی کے ہاتھ میں دیدیا۔ محمد قاسم نے کسی ایک برہمن کو بھی اس کے عہدہ سے برطرف نہیں کیا اور ان کی ایک مجلس شوریٰ قایم کرکے تمام مالی انتظامات انھیں کے سپرد کردئے۔
ملک کے کسی مندر کو توڑکر اسے مسجد نہیں بنایا یہاں تک کہ ملتان کے سورج دیوتا کے طلائی بُت کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اس نے کسی کو ترک مذہب پر مجبور نہیں کیا اور نہ اختلاف مذہب کی بنا پر اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں پر ترجیح دی۔
اس سے قبل جو معاشرتی روایتیں یہاں قایم تھیں ان کو بھی بدستور اپنے حال پر رہنے دیا۔ مثلاً یہ کہ جاٹوں کو وہاں اجازت نہ تھی کہ برہمنوں کے مقابلہ میں گھوڑوں پر سوار ہیں یا ریشمی لباس پہنیں۔ اور محمد قاسم نے اس میں بھی کوئی تعرض نہیں کیا، حالانکہ یہ بات عدم مساوات اصول اسلام کے خلاف تھی۔
فتح سندھ کے بعد گو یہاں اسلامی قانون بھی رائج ہوگیا تھا لیکن ہندو اسلامی قانون ماننے پر مجبور نہیں کئے گئے وہ اپنے تمام معاملات حسب دستور پنچایت کے ذریعہ سے طے کرتے تھے۔
جب کوئی جماعت کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہے تو عموماً مفتوح قوم کے افراد کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں ہوتا اور وہ اپنے تفوق کے اظہار میں نامناسب طریقے استعمال کرتے ہیں، اسی خیال کے پیش نظر محمد قاسم نے عرب سرداروں کو شہر کے اندر رہنے کی اجازت نہیں دی اور عرب فوجوں کے لئے شہر سے دور چھاؤنیاں بنائیں۔
یہ وہ حالات ہیں، جن پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں اور ہر شخص ان سے مسلم فرمانرواؤں کی رواداری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۲)

مسلم فاتحین میں محمود غزنوی اپنے حملۂ سومناتھ کی وجہ سے کافی بدنام ہے، لیکن اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے یہ تاخت مذہبی نقطۂ نظر یا اشاعت اسلام کی غرض سے کی، درست نہیں، بلکہ اس کا سبب محض دولت و اقتدار کا حصول تھا حملۂ سومناتھ کے سلسلہ میں مغربی مورخین نے اسے ہمیشہ بُت شکن کے لقب سے یاد کیا ہے اور یہ لفظ انھوں نے صرف اس لئے اختیار کیا کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو مسموم کیا جائے، لیکن البیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سومناتھ، چاند دیوتا کا محض استھان تھا اور وہاں کوئی بُت نصب نہ تھا، لیکن اگر اس بیان کو غلط سمجھا جائے اور اگر واقعی وہاں کوئی بُت تھا تو اس کے توڑنے کا ذکر قدیم مورخین کے یہاں نہیں پایا جاتا، اور مسٹر ولسن کا خیال بھی یہی ہے کہ محمود نے سومناتھ میں کوئی بُت نہیں توڑا۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو بھی ہم محمود کا یہ عمل مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ اس کا ذاتی تعلق تھا، جس کا محرک زیادہ تر دولت کی طمع تھی۔
علاوہ اس کے محمود نے ہندوستان میں اپنی کوئی حکومت بھی قایم نہیں کی، ہمیشہ تاخت کی اور چلا گیا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا تو البتہ ہندوستان میں غزنوی حکومت کی داغ بیل پڑی، لیکن ہم کو اس کے عہد میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے اس کا تعصب ظاہر ہوتا ہو، بلکہ برخلاف اس کے ہندوؤں کے ساتھ اس کے خوشگوار تعلق کا ایک بڑا ثبوت

یہ ملتا ہے کہ جب نیال نگین عامل پنجاب نے بغاوت کی اور اپنی تاخت کے سلسلہ میں وہ بنارس تک پہونچ گیا تو مسعود نے اسکی سرکوبی کے لئے ایک ہندو سردار تلک ہی کو مامور کیا جس نے نیال نگین کو شکست دے کر اس کا سر غزنی بھیجدیا۔

(۳)

غزنوی خاندان کے بعد غوری خاندان نے اس کی جگہ لی جس کا اولین فرمانروا شہاب الدین غوری تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اس کی زندگی ہر وقت میدانِ جنگ ہی میں بسر ہوتی تھی اور ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کے لئے وہ ہمیشہ یہاں کے راجاؤں سے لڑتا رہا لیکن اس نے اسلامی شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔

اس کے سخت معرکوں میں ایک معرکہ وہ تھا جو راجہ بنارس اور اس کے درمیان پیش آیا۔ لیکن ابن اثیر نے اس جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی فوجوں نے انتہائی غیظ کی حالت میں بھی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ کسی ہندو کی مذہبی دلآزاری کی۔

اس سے زیادہ ایک اور واقعہ اس کی سلامت روی و انصاف پسندی کا یہ ہے کہ جب نہروالہ میں شکست کھانے کے بعد لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک سردار واسا بھرنے لاکھوں روپیہ کا سامان غزنی روانہ کیا ہے اور لوگوں نے اسے تحریری مشورہ دیا کہ یہ سامان ضبط کر کے اس کی رقم سے دوسری فوج نہروالہ پر حملہ کرنے کے لئے طیار کی جائے، لیکن شہاب الدین محمد غوری نے اس تحریر کی پشت پر یہ جواب لکھ کر واپس کر دیا کہ "یہ انصاف کے خلاف ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا"

غوریوں کے بعد ہندوستان میں غلام خاندان کی حکومت شروع ہوئی جس کا سب سے زیادہ مشہور فرد قطب الدین ایبک تھا، اور اس کے عہد میں بھی ہندو مسلمان دونوں دوش بدوش امور سلطنت میں حصہ لیتے تھے اور کبھی کسی ہندو کو اس کی طرف سے تعصب کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

یہی حال شمس الدین التمش کا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"وہ بڑا عادل بادشاہ تھا اس نے حکم دیدیا تھا کہ سوا فریادی اور مظلوم کے کوئی اور شخص رنگین کپڑا نہ پہنے۔ چنانچہ جب وہ کسی شخص کو رنگین لباس میں دیکھتا تو فوراً اس کو بلا کر حالات دریافت کرتا۔ وہ انصاف کے لئے شب و روز مستعد رہتا اس نے محل کے دروازہ پر دو شیر سنگ مرمر کے نصب کئے تھے جن کے گلے میں زنجیریں ڈال کر دو گھنٹیاں ان میں باندھ دی تھیں۔ اگر کوئی مظلوم رات کو بھی اگر زنجیر کو ہلاتا تو وہ فوراً محل سے باہر آکر اس کی فریاد سنتا"

اس کے بعد خلجیوں کی حکومت شروع ہوئی اور ۱۲۰ سال تک قایم رہی، لیکن اس عہد میں کوئی ایک واقعہ بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا کہ ہندوؤں کو اس کی طرف سے کسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ بلکہ خسرو خاں کا دربار تو ہر وقت مندو سرداروں ہی سے بھرا رہتا تھا۔

اس کے بعد عہدِ تغلق شروع ہوا جو تقریباً ایک صدی تک قایم رہا۔

محمد بن تغلق اس خاندان کا بڑا کامیاب و مشہور فرمانروا تھا۔ اور اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا شیوۂ عدل و انصاف تھا۔ اس باب میں وہ اتنا سخت تھا کہ خود اپنی ذات کو بھی قانونی گرفت سے مستثنیٰ نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی شہر کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کر دیا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا اور وہ معمولی ملزم کی طرح عدالت گاہ میں حاضر ہو گیا اور اس وقت تک باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہ ہوا۔"

تغلق خاندان کے بعد سید خاندان کی حکومت ہوئی، لیکن نصف صدی سے بھی کم قایم رہی، اس کے بعد لودی خاندان آیا، اس خاندان کا بانی بہلول لودی باوجود شاہانہ عزایم کے بڑا درویش صفت انسان تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، تو اس وقت تک چین نہ لیتا، جب تک اسے راضی نہ کر لیتا، یہاں تک کہ وہ اس کے قدموں میں پگڑی

تک ڈال دیتا۔

اس خاندان کا ایک اور فرمانروا سکندر لودی تھا۔ اس نے ہندوؤں کی طرف خاص توجہ سے کام لیا اور انھیں فارسی، عربی کی تعلیم دلاکر ملک کے تمام انتظامی محکمے ان کے سپرد کردئے اور بہت سے ہندو شعراء کے وظایف اس نے مقرر کردئے۔

اسی سلسلہ میں شیر شاہ کی بے تعصبی اور انصاف پسندی کا ایک مشہور واقعہ بھی سُن لیجئے:۔

"شیر شاہ کا لڑکا سلطان عادل خاں ایک دن آگرہ کے کسی کوچہ سے ہاتھی پر سوار ہوکر نکلا، تو راستہ میں ایک بقال کے مکان کی طرف سے گزرا جس کی دیواریں پست تھیں، اس نے یہاں اس کی بیوی کو دیکھ کر پان کا ایک بیڑا اسکی طرف پھینکا، عورت بہت غیرتمند تھی، اس نے خودکشی کا ارادہ کرلیا، اس کا شوہر معاملہ کو دربار تک لے گیا اور شیر شاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ بقال بھی ہاتھی پر سوار ہوکر شاہزادہ عادل کی بیگم کے سامنے سے گزرے اور پان کا بیڑا اس کی طرف پھینکے"۔

(۴)

دکن کی بہمنی حکومت کو اول اول عرصہ تک ہندو راجاؤں سے برسرپیکار رہنا پڑا اس لئے ہندو مسلم تعلقات کا ناخوشگوار رہنا ضروری تھا، لیکن جب یہ کشاکش ختم ہوئی اور امن وسکون کا دور شروع ہوا تو نہ صرف نظم ونسق بلکہ فوج میں بھی ہندوؤں کو کافی درخور حاصل ہوگیا۔

اس کے بعد جب بہمنی حکومت کے صوبہ داروں نے اپنی حکومتیں جدا جدا قایم کرلیں، تو بھی نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کو بدستور ان کی خدمات پر بحال رکھا گیا بلکہ عادل شاہ والیِ بیجاپور نے تو شاہی دفاتر کی زبان بھی ہندی کردی محض اس لئے کہ ہندو فارسی سے واقف نہ تھے چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندی کردو بہامنہ راصاحب دخل گردانید"

(یعنی دفتر کی زبان فارسی سے ہندی کردی اور برہمنوں کو دفتروں کا انچارج کردیا)

دکن کی مُسلم حکومتوں میں مالگزاری کے محکمے اکثر و بیشتر ہندوؤں ہی کے سپرد کردئے اور احمد نگر کی عادل شاہی حکومت نے کثرت سے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا جن میں ایک سیواجی بھی تھا۔

کشمیر کے اسلامی دورِ حکومت میں بھی ہندوؤں کو کبھی کوئی موقع شکایت کا نہیں ملا، البتہ سلطان سکندر کے زمانہ میں اس کے وزیر سرکھبٹ نامی نے بے شک ہندوؤں پر ایسے مظالم کئے اور ان میں سے اکثر کو ترک وطن کرنا پڑا، لیکن اس کے بعد سلطان زین العابدین نے ان تمام زیادتیوں کی پوری طرح تلافی کردی اور تمام برہمنوں کو جو باہر چلے گئے تھے ان کو بلایا، بسایا اور اس حد تک ان کے جذبات کا خیال کیا کہ گاؤکشی کی ممانعت کردی اور رسم ستی کی بھی اجازت دیدی۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ آثر رحیمی)

(۵)

مُغلیہ دور کا آغاز دراصل بابر کے وقت سے شروع ہوتا ہے جب ابراہیم لودی کے بعد دہلی میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اس لئے سب سے پہلے بابر ہی کو دیکھئے کہ اس نے ہندوؤں کے جذبات کا کتنا لحاظ کیا۔

اس نے مرتے وقت جو وصیت اپنے بیٹے ہمایوں کو کی ہے اس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:۔

۱ - مذہبی تعصب سے ہمیشہ پرہیز کرو اور بلاتفریق قوم ومذہب صرف انصاف پر نگاہ رکھو۔

۲ - گائے کی قربانی سے باز آؤ تاکہ ہندوؤں کے دل آزردہ نہ ہوں۔

۳ - کسی پرستش گاہ کو منہدم نہ کرو۔

۴ - شیعہ، سُنّی جھگڑے میں کبھی نہ پڑو۔
۵ - اپنی رعایا کے عادات و مراسم کا لحاظ رکھو۔
(یہ وصیت نامہ بھوپال کے کتب خانہ میں موجود ہے)

ہمایوں کو تو خیر زمانہ نے فرصت نہ دی کہ وہ چین سے بیٹھ کر حکومت کر سکتا۔ لیکن اکبر نے بابر کی اس وصیت پر جیسا عمل کیا وہ سب پر ظاہر ہے، یہاں تک کہ فوج اور مال کے بڑے بڑے محکمے ہندوؤں کے سپرد کر دئے۔ اکبری عہد کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندو خود بھی اس کی رواداریوں کے معترف ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں بھی ہندوؤں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور اس کے منصبداروں میں ہمیں راجہ بھیم نراین، موہن داس، رام سنگھ اور راجہ نتھامل وغیرہ کا نام بھی نظر آتا ہے اور درباری شعراء میں طالب آملی کے نام کے ساتھ بھرتا چاریہ بنارسی، پھبتان مصر، جدد پ سینلی وغیرہ بھی۔

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کے عہد میں کتنے نئے مندر تعمیر ہوئے، لیکن اس سے غالباً سب واقف ہوں گے کہ بندرابن کے جنگل میں گوبند دیوی کا عظیم الشان مندر اسی عہد کی یادگار ہے۔

شاہجہاں کے عہد میں ہندوؤں کی جتنی قدر دانی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہفت ہزاری سے لے کر یک ہزاری تک ہندو منصب داروں کی تعداد اس کے زمانہ میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی۔

شاہجہاں کے دربار میں مسلمان علماء و شعراء اور ہندو پنڈتوں و کویوں کا ایک درجہ تھا، چنانچہ سندر نامی ایک فاضل برہمن اسی عہد کا ایک کوی تھا جسے شاہجہاں نے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔

عہدِ مغلیہ میں سب سے زیادہ بدنام اورنگ زیب ہے جس پر متعدد الزام قایم کئے جاتے ہیں :-

۱ - ایک یہ کہ اس نے مندر توڑے ـــــ قبل اس سے کہ اورنگ زیب کے اس طرزِ عمل پر کوئی رائے زنی کیجائے، اس وقت کی ہندو ذہنیت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اکبر سے لیکر عہد شاہجہاں تک کی رواداریوں نے ہندوؤں کی ذہنیت میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ مسلمان عورتوں سے شادی بھی کرنے لگے تھے، پرانی مسجدوں کو توڑ کر مندروں میں تبدیل کرتے چلے جا رہے تھے اور نئے مندروں کی تعمیر کی تو کچھ انتہا نہ تھی۔ ہندو پاٹ شالاؤں میں مسلمان بچوں کو ہندو مذہب اور ہندو دیومالا کی تعلیم دینے کا رواج عام ہو گیا تھا اور چونکہ یہ تعلیم ان کو اسلام سے منحرف کر دینے والی تھی اس لئے اورنگ زیب نے اس کی ممانعت کا فرمان جاری کیا۔ اس فرمان پر متھرا، بنارس اور ادے پور کے ہندوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا اور زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے اس نے عبدالنبی خاں کو مامور کیا، لیکن یہ کام اس سے نہ ہو سکا تو اورنگ زیب خود گیا اور چند مندروں کو منہدم کرا دیا۔

ان حالات کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ سخت متعصب تھا اور محض تعصب کی بنا پر اس نے مندر توڑے درست نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مذہبی عصبیت کی بنا پر کوئی مندر نہیں توڑا بلکہ محض سیاسی مصلحت کی بنا پر انھیں مندروں کو توڑا جو حکومت کے خلاف سازشوں کا مرکز بنے ہوئے تھے، اگر اسے مذہبی تعصب ہوتا تو وہ سیکڑوں مندروں کے لئے جاید اد کیوں وقف کرتا جس سے متھرا، بنارس، بلیا اور گیا کے بہت سے مندر آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔

۲ - دوسرا الزام اورنگ زیب پر یہ عاید کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر ٹیکس یا جزیہ عاید کرنے کے ان کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ شاہجہاں اور جہانگیر کے زمانہ میں بھی غیر مسلم اقوام کی حفاظت کے لئے جزیہ مقرر تھا اور وہ سب خوشی سے اس کو ادا کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب نے بھی اسی دستور کو جاری رکھا تو کیوں اسے نئی بات سمجھا جائے اور کیوں یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اس نے بھاری ٹیکس اس لئے لگائے تھے کہ ہندو مسلمان ہو جائیں جبکہ ٹیکس کی مقدار تین روپیہ سے لیکر زیادہ سے زیادہ اکیس روپیہ تھی۔ ظاہر ہے

کہ یہ رقم ایسی نہیں جو کسی ہندو کو تبدیل مذہب پر مجبور کر دیتی۔

۳۔ تیسرا الزام اس پر یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اس وقت وصول مالگذاری کا تمام انتظام اور حساب و کتاب کائیتھوں کے ہاتھ میں تھا اور جب انھوں نے رشوت ستانی شروع کر دی تو اورنگ زیب نے ان کے خلاف سخت احکام جاری کئے، لیکن حسب بیان خافی خاں بعد کو یہ تمام احکام منسوخ کر دئے، اور پنج ہزاری منصب سے لے کر دو ہزاری منصب تک کے امراء کی جو فہرست درج کتب ہے اس میں درجنوں ہندو امراء کے نام نظر آتے ہیں۔

حکومت کے انتظام میں وہ مذہبی جذبات کو بالکل دخل نہ دیتا تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب ایک بار اس سے یہ کہا گیا کہ فلاں آتش پرست کو معزول کر کے اس کی جگہ مسلمان کا تقرر کیا جائے تو اس نے جواب دیا کہ "دنیا کے معاملات میں مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ لوگوں کے استعداد کے مطابق شاہی نوکریاں دی جائیں گی خواہ ان کا مذہب کچھ ہو"۔

(۶)

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا نہ نکلا جو اس کے مقرر کئے ہوئے نظام کو قایم رکھ سکتا، تاہم بہادر شاہ اول سے لیکر محمد شاہ کے عہد حکومت تک ہندو عہدہ داروں کا اقتدار بدستور قایم رہا، جن کی فہرست کافی طویل ہے۔

زوال عہد مغلیہ کے دوران میں متعدد خود مختار حکومتیں بنگال، بہار، جونپور، گجرات، خاندیس، مالوہ وغیرہ میں قایم ہو گئیں لیکن ان میں بھی ہمیشہ ہندوؤں کا خاص لحاظ رکھا گیا اور بڑی بڑی خدمات ان کے سپرد کی گئیں۔

ادارۂ فروغ اُردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور

اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعۂ رجسٹری مل جائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہو، اور محصول ڈاک بحساب ۱۵ فی صدی روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاست الٰہیہ ۔ عہ	امراؤ جان ادا ۔ للعہ	جوڑ توڑ ۔۔۔ للعہ	سسرال ۔ عہ	اُردو غزلگوئی ۔۔ عہ	مکاتیب نمبر مجلد عہ
ہماری داستانیں ۔ صہ	خدانخواستہ ۔ تے	کارٹون ۔۔۔ تے	مضامین شوکت عہ	عرب کے تین مدبر ۔۔ تے	طنز و مزاح نمبر عہ
مضامین جمال الدین افغانی صہ	کتیا ۔۔۔ تے	قاضی جی ۔۔ تے	غزالہ ۔۔۔ تے	خالد بن ولید ۔۔ للعہ	پطرس نمبر ۔۔ معہ
انتقاد ۔۔۔ تے	بقراط ۔۔۔ عہ	وغیرہ وغیرہ ۔۔ تے	سودیشی ریل ۔ تے	منٹو نمبر مجلد ۔۔۔ تے	شخصیات نمبر نمبر ۲ مجلد عہ

میر کی شاعری اور شخصیت

(یوسف شریف الدین بی، اے)

شاعری میں اس وقت تک عظمت پیدا نہیں ہوتی جب تک وہ شخصیت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ شخصیت کی جھلکیاں شاعری میں صرف اسالیب تک محدود نہیں بلکہ شاعر کے لب و لہجہ، تیور، آواز اور اس کے زیر و بم، خیال اس کے نشو و نما اور شعر کی پوری فضا میں نہاں ہوتی ہے۔ میر کے کلام کا مطالعہ ان کی شخصیت کا مطالعہ ہے۔ اور میر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

دل نے ہم کو مثال آئینہ ایک عالم کا روشناس کیا

یعنی دل پر جو گزرتی ہے وہ اسی کا اظہار کر دیتے ہیں۔

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یار و پرائی بات پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پر آئی بات

یہ منہ پر آئی ہوئی بات کو نہ تھامنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم کو اپنا کلیجہ تھام لینا پڑتا ہے۔ میر کی شخصیت میں درد و غم ہی سب کچھ ہے۔ یہ اسی جذبہ کی شدت ہے جو ان کی شخصیت میں طوفان برپا کئے ہوئے ہے اور اسی طوفان کی موجوں کی بلندی ان کی شاعری کا اوج ہے۔

غم، زندگی کی حقیقتوں میں ایک مسلم حقیقت ہے۔ جو طبیعت غم سے متاثر ہوتی ہے وہ دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ غم سے اثر پذیری ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے تمام ادبی شاہکار المناک واقعات ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان خواہ قوم کسی ملک اور کسی نسل سے تعلق رکھے، احساس درد ہی اعلیٰ درجے کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔ ارسطو اسی لئے شاعری کی اہمیت کا قایل ہے اور اسی بنا پر وہ افلاطون کی تردید کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ درد انگیز شاعری انسان کی ضرورت سے زیادہ غمگین جذبات کو ابھار کر نکال باہر کرتی ہے اس کے لئے وہ ——— کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی رونے رلانے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ میر کی شاعری بھی جی کو ہلکا کرنے والی شاعری ہے، غم ان کی شاعری کی روح ہے۔ کہتے ہیں:۔

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا مرے دیوان میں

لیکن "قیامت کا سا ہنگامہ" ان کے دیوان میں کہاں سے آگیا؟

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ ان کی شخصیت کا پرتو ہے مگر سوال یہ ہے کہ شخصیت میر، یہ پناہ درد و غم کہاں سے آگیا۔ بات یہ ہے کہ میر کا زمانہ غم کا زمانہ تھا، مغلیہ سلطنت کا آفتاب گہنا چکا تھا۔ بیرونی حملوں کی وجہ سے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ نے دہلی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور ان تمام حالات نے ساری فضا پر قنوطیت اور یاس کو مسلط کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنے مستقبل کو غیر محفوظ تصور کر رہا تھا، اسی لئے "میر کے دور میں جو اردو کا سب سے بڑا دور مانا جاتا ہے، غم دوستی اور یاس پرستی ہر چھوٹے بڑے شاعر کے ضمیر میں داخل تھی اور ان کے کلام کی اصلی روح تھی" یہی حالات تھے جنھوں نے میر سے اس قسم کے اشعار کہلوائے۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

میرے تغیر حال پر مت جا، — اتفاقات ہیں زمانے کے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

مجلس آفاق میں پروانہ ساں — میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا — اس عشق کی وادی میں ہر طور بسر کرنا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

دیکھا آپ نے ان کے اشعار میں اس زمانہ کے دل کی دھڑکن کتنی صاف سنائی دیتی ہے۔

خارجی حالات شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ شخصیت میں خارجی حالات جذب ہو کر شخصیت کا رنگ متعین کرتے ہیں، چاک کو روشنائی میں ڈبو دیجئے چاک کی ماہیت نہیں بدلے گی، صرف روشنائی کے جذب ہونے سے ایک رنگ آجائے گا۔ اسی طرح ہمارے اُردو کے عظیم شاعروں میر ہوں یا غالب خارجی حالات سے ایک رنگ تو جذب کرتے ہیں لیکن یہ خارجی رنگ کا اکتساب داخلیت سے ہم آہنگ ہو کر ایک نیا رنگ دیتا ہے جو خارجی نہیں معلوم ہوتا۔ روشنائی جذب شدہ چاک سے لکیر کھینچئے لکیر تو چاک ہی کی رہے گی گو وہ رنگین ہو جائے گی، یہ میر کی شخصیت کی بے پناہ جاذبیت ہی تھی جس نے کٹھن حالات کو جذب کر لیا اور اس طرح انھیں مجذوب ہونے سے بچا لیا۔ میر کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے زمانہ کے سارے کرب و اضطراب کو ظاہر کرتی ہے۔ میر کی شخصیت کی تعمیر میں صرف زمانے کے مصائب کا ہاتھ نہیں۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

بلکہ خود ان کی اپنی زندگی سرتاپا المناک حادثوں کی نذر ہو گئی۔ دس گیارہ سال کے تھے کہ ان کے عزیز ترین دوست، ساتھی، اتالیق جو کچھ بھی کہہ لیجئے ان کا انتقال ہو گیا۔ میری مراد ان کے والد کے مربی امان اللہ سے ہے۔ ابھی اس غم سے چھٹکارا نہیں ملا تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ یہی نہیں جو زندہ تھے انھوں نے آنکھیں چرالیں۔ خان آرزو کے پاس گئے وہاں سے کچھ اور تو ملا نہیں، عشق کا آزار لگا لائے لکھنؤ گئے تو وہاں اپنی اعلیٰ دماغی کی وجہ سے جو بد دماغی کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے، کسی امیر سے نباہ نہ ہو سکی۔ زندگی میں انھیں کبھی سکون نصیب نہ ہو سکا لیکن زندگی کی کشاکش ان کی شخصیت کو گرما دیا تھا اور اسی شخصیت کے سوز نے ان کی شاعری کو بھی گرما دیا اور یہی گرمی آج بھی اُردو شاعری کے جسم میں گرم گرم خون دوڑا رہی ہے۔

ہر صبح غموں سے شام کی ہے میں نے — خونابہ کشی مدام کی ہے میں نے

یہ مہلت کم جسے کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

میر نے اپنا اور سارے زمانہ کا غم اپنے دل میں سمو لیا تھا، وہ ایک باعظمت شخصیت اور بلند کردار کے مالک تھے۔ فقر، خودداری، دردمندی توکل، سوز و گداز، یہ خصوصیات جب شاعری میں آجاتی ہیں تو لب و لہجہ میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کی شخصیت ان کی شاعری کے لئے معمار کا کام دیتی ہے۔ ورنہ "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" ان کی شخصیت اور شاعری کے ملاپ سے ایک آئینہ طیار ہو گیا، لیکن آئینہ پر جلا آسانی سے نہیں آجاتی، اس کے لئے میر زندگی بھر مصیبتیں اُٹھاتے رہے، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے:-

کس کس طرح سے عمر کو کاٹا ہے میر نے — تب آخری عمر میں یہ رنجیدہ سر کہا

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا

میر نے زمانہ کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زمانہ کس کس طرح سے ستاتا ہے، اس شعور نے ایک ایسی بصیرت ان میں پیدا کر دی تھی جو آج ہماری بصارت بنی ہوئی ہے۔ یہ اشعار:-

اتفاقات زمانہ پر مت جا — میر دیتا ہے روزگار فریب

بس جی دیئے نہیں ہے امکان یہاں سے جانا بسمل گہہ جہاں میں اب ہم تو میر آئے

مرنا ہے، خاک ہونا، ہو خاک اڑتے پھرنا اس راہ میں ابھی درپیش مرحلے ہیں

شکوہ آبلہ ابھی سے میر، ہے پیارے ہنوز دلی دور

ان اشعار میں بظاہر قنوطیت کا جذبہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ قنوطیت نہیں ہے بلکہ حقایق کا ادراک ہے۔ میر زندگی بھر ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان کے لئے ہر سکون وقفہ تھا "احساس طوفاں کے لئے"۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ نئے مرحلے آتے تھے۔ وہ آنے والی مصیبتوں سے بھاگتے نہیں تھے بلکہ ان کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو طیار کرتے تھے۔ وہ ناکامیوں سے گھبرا کر فرار کی راہ اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ ایک خاص "سلیقے" سے اسے نباہتے تھے۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

وہ "ابتداء عشق" میں رونے والے نہ تھے بلکہ دیکھتے تھے "آگے آگے" کیا ہوتا ہے اور ہر طرح کی نامرادانہ زندگی بسر کرنے کی جرأت رکھتے تھے:-

نامرادانہ زیست کرتا تھا میر کا طور یاد ہے ہم کو

جور دلبر سے کیا ہوں آزردہ میر اس چار دن کے جینے پر

"جور دلبر" سے آزردہ ہو کر خود زندگی کی بے ثباتی کا خیال کرنا بظاہر ایک قنوطی جذبہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے مایوسی نہیں بلکہ مقابلہ کی بے پناہ قوت ظاہر ہوتی ہے، جب چھوٹی سی مصیبت سر پر مسلط ہو اس وقت ایک آنے والی بڑی مصیبت کا خیال اس بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور انسان موجودہ مصیبت کو خاطر میں نہیں لاتا۔

راہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بھل ہم بھی شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

وہ "اپنی شکستہ پائی" سے مایوس نہیں ہیں بلکہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں، اور یہی ان کی شخصیت کا حقیقی رنگ ہے جسکی بدولت انھوں نے یکساں رفتار سے اپنی زندگی کی منزلیں طے کیں۔ وہ دہلی میں ہوں یا لکھنؤ میں، آصف الدولہ کے پاس ہوں یا آصف الدولہ کے یہاں ہر جگہ اپنا استغنا ساتھ لئے رہے۔ یہی ان کی شخصیت کی عظمت ہے جو ان کی شاعری کو عظیم سے عظیم تر بناتی ہے۔

طریق عشق میں ہے رونا دل، پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

دل کی خدائی میں انھوں نے اپنی تمام عمر گزار دی۔ جس میں انھیں لذت بھی ملتی ہے۔

نہیں عشق کا درد لذت سے خالی جسے ذوق ہے وہ مزہ جانتا ہے

لیکن "نیش عشق" جلدی گوارا نہیں ہو سکتا۔ "زخم جگر" سے لذت حاصل کرنے کے لئے "ایک مدت" چاہیے، ظاہر ہے کہ میر نے "ایک مدت" گوارا ہے جب ہی تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

نہیں دسواس جی گنوانے کے ہائے رے ذوق دل لگانے کے

یہ جی گنوانے کے وسواس نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ منزل ملنے کے بعد بھی سر سے "سودائے جستجو" نہیں گیا۔

ہر قدم پر تھی اس کی منزل یک سر سے سودائے جستجو نہ گیا

یہی "سودائے جستجو" ان کی شخصیت کی عظمت تھی جس نے کبھی ان کو آسودہ حال ہونے نہیں دیا۔ انھیں بھی دربار میں اونچے سے اونچا مقام مل سکتا تھا، لیکن انھوں نے کسی قیمت پر بھی اپنے آپ کو بیچنا گوارا نہیں کیا۔ ان کی شخصیت کے استغنا نے ہمیشہ انھیں تھامے رکھا کیونکہ انھیں "عظمت" کا پورا احساس تھا ——— مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔

اور مصیبت، غم، رنج، درد، تکلیف سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن انسانیت کے بلند مقام سے ایک لحظہ بھی نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ "درد و غم" جمع کرتے رہے اور اسی کو اپنی شاعری میں سموتے رہے ——— ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے درد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

اُردو ادب

اور

تلمیحات

(محمود نیازی)

علم بیان کی اصطلاح میں تلمیح کے معنی کلام میں کسی قصہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ یہ لفظ "لمح" سے مشتق ہے جس کے معنی آنکھ چرا کر دیکھنے کے ہیں اسی لئے ہر تلمیح کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی ڈھکا چھپا قصہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک "تلمیح" سے مراد صرف وہ الفاظ ہیں جو کسی "تاریخی" واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوں، حالانکہ تلمیح کے لئے تاریخی ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ لفظ تلمیح قرار دیا جا سکتا ہے جس کے پیچھے "کوئی" روایت پوشیدہ ہو۔ چاہے وہ تاریخی ہو یا غیر تاریخی۔ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ حقیقی ہو یا فرضی۔ بہت سے محاورے۔ ضرب المثلوں اور کہاوتوں کو تلمیح قرار دیا جا سکتا ہے اگر وہ کسی قصہ پر مبنی ہوں، تلمیح کے لئے زمانہ کی قید بھی نہیں ہے اس میں گزرے ہوئے اور آنے والے تمام واقعات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ "عصائے موسیٰ" کی تلمیح ان گزشتہ واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان پیش آئے تھے، اسی طرح میدان حشر۔ صور اسرافیل، یاجوج ماجوج اور دجال کی تلمیحات آئندہ پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

تلمیح کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام واقعات کے مفہوم پر حاوی ہو۔ بعض تلمیحات ایسی بھی ہیں جن میں ان سے متعلق واقعہ کا خفیف سا اشارہ بھی نہیں ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی جب وہ زبان پر آتی ہیں تو سننے والے کے ذہن میں واقعہ کی پوری تصویر آجاتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ صرف حقیقی واقعات کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ کو تلمیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ تلمیحی قصہ کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں ہے وہ صحیح بھی ہو۔ اس کی بنیاد صرف "دائمی شہرت" پر ہوتی ہے، اگر کوئی قصہ عام فہم اور مشہور ہے تو اس کا اشارہ سنتے ہی ہر شخص کے سامنے پورے قصہ کی خیالی تصویر آجاتی ہے لیکن اگر کوئی قصہ بالکل صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے لیکن وہ مشہور نہیں ہے تو اسے تلمیح نہیں کہا جا سکتا۔ "بچھو گھاس" ایک قسم کی گھاس ہے جس کے چھو جانے سے ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو لیکن یہ مشہور نہیں ہے اس لئے تلمیح نہیں ہے، دوسری طرف "پارس" کی تلمیح ہے کہ بونتو ہر شخص جانتا ہے کہ پارس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، لیکن یہ نام سنتے ہی ہر شخص کے سامنے ایسے پتھر کی خیالی تصویر آجاتی ہے چھو جانے سے لوہا سونا بن جاتا ہے۔ تلمیح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے جوں کی توں نقل کر دیا جائے اس میں کسی موشگافی یا رائے زنی کی ضرورت نہیں۔

تلمیحات کو وضع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ ظاہر ہے کہ انسان نے تہذیب و تمدن کی جانب رفتہ رفتہ قدم بڑھایا ہے اور لاکھوں برس میں یہ منزلیں طے کی ہیں۔ اس طویل سفر میں ہزاروں ایسے واقعات اور حالات پیش آئے ہیں جن حوالہ دینا اور ان کو یاد رکھنا آنے والی نسلوں کے لئے ضروری تھا اس کے علاوہ مذہبی پیشواؤں، روحانی مبلغوں اور پیغمبروں نے بہت سے واقعات کی پیشین گوئیاں کی ہیں اور خوشخبریاں سنائی ہیں ان کی تفصیلات کو جاننا بھی ضروری تھا چونکہ ایک ہی واقعہ کو بار بار دہرانے سے وقت بھی ضایع ہوتا تھا

اور سننے والے بھی اکتا جاتے تھے اسی لئے ایسے مختصر اشارے وضع کئے گئے جو ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوں - یہ اشارے ہماری گزشتہ اور آیندہ تاریخ - معاشرت - مشاغل اور مذہبی عقاید و اوہام کے عنوانات ہیں، ان کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہماری قوم اور آباو اجداد کی معاشرت اور تہذیب و تمدن میں رفتہ رفتہ کیا تبدیلیاں ہوئیں ان کے مذہبی عقاید کیا تھے اور ان میں مشہور ہونے والوں میں کون کون سے اوصاف تھے غرضکہ قوم اور ملک کے گزشتہ حالات، نمایاں واقعات اور مشہور افراد کے کارناموں کو یاد رکھنے کے لئے تلمیحات کو وضع کیا گیا ہے -

تلمیحات سے ایک فایدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان سے تشبیہ دینے میں آسانی ہوجاتی ہے - فرضی قصوں، کہانیوں، محاوروں اور ضرب المثلوں سے ہمیں جن اشخاص کا پتہ چلتا ہے ہم ان کے کارناموں، نمایاں خصوصیات اور مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر تشبیہ دینے میں کوئی دشواری محسوس نہ کریں گے چاہے اس قسم کا کوئی نمونہ حقیقتاً ہماری گزشتہ تاریخ میں ہو یا نہ ہو - کسی بہادر اور جری انسان کے لئے رستم و اسفندیار اور مکار و ظالم کے لئے خواجہ سگ پرست کی تشبیہات موجود ہیں جب بھی یہ نام ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان کے اوصاف کی مکمل تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے -

تلمیحات کے متعلق امریکہ کا مشہور مضمون نگار آسبورن لکھتا ہے کہ[1]:-

"وہ قدموں کے نشان ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، حالات، مرغوبات، اوہام، رسم و رواج اور واقعات کا سراغ لگا سکتے ہیں"

فرانس کے مشہور مصنف "شوئی کران" نے تلمیحی لفظ کی وضاحت اس طرح کی ہے[2]:-

"جب میں کسی فصیح البیان شخص کی زبان سے انقلاب فرانس کا لفظ سنتا ہوں تو میرا دل ان وحشت خیز اور دہشت انگیز حالات سے بھر جاتا ہے جن کے سبب سے دریائے سین کی وادیاں خون سے لبریز ہوچکی ہیں مگر اس کے فوراً ہی بعد میرے خیال کا رخ اس شاندار جمہوریت کی طرف پھر جاتا ہے جس کی بنیادیں ان خون سے بھری ہوئی وادیوں سے اٹھائی گئیں"

شوئی کران کے اس قول سے کس کو انکار ہوسکتا ہے - کیونکہ "جنگ آزادی" کا نام سنتے ہی خود ہماری نگاہوں میں وہ تمام ہولناک واقعات پھر جاتے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے غدر سے ۱۹۴۷ء تک پیش آتے رہے - ہزاروں، لاکھوں بے گناہ معصوموں کا قتل عام، انگریزوں کے مظالم - جھانسی کی رانی اور تانتیا ٹوپی کی سرفروشیاں، بہادر شاہ ظفر کا ایثار - اشفاق اللہ اور بھگت سنگھ کی پھانسیاں، جانثاران وطن جہاں تک گاندھی، محمد علی، شوکت علی اور تلک کی تمام زندگیاں جیلوں میں کٹنا - سبھاش بابو کا عزم و استقلال اور آزادی کے درخشاں سورج کا طلوع ہونا - یہ واقعات بھلائے جانے والے نہیں ہیں اور آیندہ "جنگ آزادی" کی تلمیح ہماری آنے والی نسلوں کے سامنے انھیں تمام واقعات کی تصویر پیش کرے گی -

کسی زبان کی فصاحت اور بلاغت کا انحصار زیادہ تر تلمیحات پر ہی ہوتا ہے جن زبانوں میں تلمیحات کا ذخیرہ کم ہے وہ بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں سمجھی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں اُردو زبان کا معاملہ بھی عجیب ہے - اس میں تلمیحات کی کمی نہیں ہے، مگر اس کے بولنے والے ان سے گریز کرتے ہیں - مولانا وحیدالدین سلیم لکھتے ہیں:-

"یہاں کے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بجائے تلمیح کے ہر قصہ کو جملوں میں ادا کیا جائے - ان کو اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اصطلاح کا مفہوم جملوں میں ادا کرنے سے کاغذ اور وقت کا کتنا صرفہ ہوتا ہے اور ایک طویل

---

[1] و [2] افادات سلیم - مضمون "تلمیحات" مصنفہ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم

مطلب کو بار بار دہرانا پڑھنے والوں کو کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔"[1]

اُردو ادب میں تلمیحات کا استعمال بجائے بڑھنے کے برابر کم ہوتا جا رہا ہے اس کے بھی کئی اسباب ہیں پہلا تو یہ ہے کہ اُردو تلمیحات بیشتر غیر ملکی ہیں اور ایران و عرب کی پیداوار ہیں جب تک اس ملک پر مغربی حملہ آوروں کی حکومت رہی جن کی زبان فارسی تھی اس ملک میں صرف اسی ادب کی تلمیحات استعمال ہوتی رہیں۔ ہندو شاعری۔ ہندو مذہب۔ ہندو تاریخ اور ہندو دیومالا کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ اسی لئے ہندوستان کے عظیم دریا گنگا و جمنا۔ سندھ و برہمپتر۔ اور کرشنا و کاویری کبھی بھی دجلہ و فرات جیحوں و سیحوں کی جگہ نہ لے سکے۔ ہمالیہ کے بدلے طور و قاف کے قصے رائج رہے اسی طرح بھیم و ارجن کی جگہ رستم و اسفندیار۔ کنول و مور پنکھی کی جگہ لالہ و نرگس۔ گل و مینتی اور ہیر رانجھا کے بدلے لوگ لیلیٰ و مجنوں اور وامق و عذرا ہی کے خواب دیکھتے رہے جب مسلمانوں کا دور حکومت ختم ہوا تو ان کی تلمیحات کو بھی زوال شروع ہو گیا اور اب ان کی یہ حالت ہے کہ عام لوگ ان کو سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں اس لئے ان کا استعمال کس طرح ہو۔ ہم لوگ اگر چاہیں تو اپنی تلمیحات میں ہندوستان کے رسم و رواج عقاید و اوہام اور تاریخ و ادب کی تمام ضروری الفاظ شامل کر سکتے ہیں اور اس طرح ہماری زبان کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائیگا کہ ہم اس کے لٹریچر کو دوسری مستند زبانوں کے لٹریچر کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ یورپ کی زبانوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے لوگ اپنے ہر قسم کے خیالات کو مناسب سانچوں میں ڈھالنے کی قدرت رکھتے ہیں جبکہ ہمارے ہزاروں خیالات ایسے ہیں جن کے لئے ہمارے پاس موزوں قالب نہیں ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ یورپ کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحات کی کثرت ہے اور انکے یہاں تلمیحات کی مستقل فرہنگیں حروف تہجی کے حساب سے موجود ہیں۔ ان لوگوں نے دُنیا کی تمام دوسری قوموں کے پیغمبروں، دیویوں اوتاروں، دیوتاؤں اور بزرگوں کے قصے ترجمے کر کے اپنی زبانوں میں شامل کر لئے ہیں۔ انھوں نے غیر قوموں کے عقاید و اوہام، تاریخ و ادب اور ان کے شاعرانہ خیالات پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ ان کے سامنے ہر قوم و مذہب کے قصے کہانیاں، ڈرامے اور ناٹک موجود رہتے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنی زبان کے لئے نئی نئی تلمیحات بناتے رہتے ہیں، صرف الف لیلہ ہی یورپی تلمیحات کا ایک بڑا ماخذ ہے اس کتاب کے قصوں سے سینکڑوں تلمیحات لے کر ادبیات یورپ میں داخل کی جا چکی ہیں۔ ہندوستانی تلمیحات جو عام بول چال میں رائج ہیں ان کا احاطہ کرنا تو درکنار ان کا شمار کرنا بھی محال ہے لیکن ابھی تک ہندی یا اُردو کسی زبان میں بھی ان کو جمع کرنے اور ایک تلمیحی فرہنگ تالیف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

تلمیحات کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ان کو عقلاً اور مذہباً بھی تسلیم کیا جائے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ "وہ رستم جیسا بہادر اور حاتم جیسا سخی ہے" تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم رستم اور حاتم کے وجود کے بھی قایل ہوں۔ تلمیحات کا اثر تو صرف ہمارے داغوں پر ہوتا ہے، جیسے ناولوں اور قصے کہانیوں کا۔ ناول پڑھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ مصنوعی اور من گھڑت قصہ پڑھ رہا ہے لیکن ہنسی کے موقعہ پر وہ بے اختیار ہنسنے لگتا ہے اور درد انگیز واقعہ پر اس کے آنسو گرنے لگتے ہیں۔

ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے تلمیحی فرہنگ کی ضرورت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر ترقی یافتہ زبان کے لئے تلمیحات، اصطلاحات، محاورات اور ضرب المثال کی مکمل اور جامع فرہنگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تلمیحی فرہنگ کی تدوین کے بارے میں ایک انگریز تلمیح نگار لکھتا ہے:

"جن واقعات پر چوبیس گھنٹے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ان کا علم حاصل کرنے میں آج کل کے بعض نوجوان گریز کرتے ہیں۔ وہ دیرینہ حالات کو تقویم پارینہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ تو بس ان باتوں کو سننا چاہتے ہیں، جو آجکل ان کے گرد و پیش سنائی دیتی ہیں۔ تلمیحات جو ہماری قوم کے گزشتہ حالات و خیالات کے اشارے ہیں جب ان کی نظر سے گزرتی ہیں تو وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں کیونکہ ان کے حافظہ میں وہ حالات اور خیالات موجود نہیں اسی غرض سے کہ ان کے حافظہ پر بار نہ پڑے تلمیحات کی فرہنگیں مرتب کی گئی ہیں۔"[2]

ابھی تک جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں ہے کہ ہر ترقی یافتہ زبان کے لئے تلمیحی فرہنگ کا ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر وہ دوسری زبانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس سلسلہ میں ابھی تک اُردو میں کوئی کام ہی نہیں ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے اس سے ہماری تلمیحی فرہنگ کی ضرورت پوری نہیں ہوتی ہے۔ فضل الٰہی صاحب عارف نے "تلمیحات اقبال" کے نام سے صرف اقبال کے تلمیحات جمع کر کے ایک مفید کام انجام دیا ہے اس کے علاوہ "تلمیحات" اور "ادبی کہانیاں" کے نام سے ہمیں دو چھوٹی چھوٹی تصانیف اور ملتی ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں انتہائی مختصر ہیں۔ ابھی تک تلمیحات کی لغت کا کام بڑی حد تک "فرہنگ آصفیہ" نے انجام دیا ہے لیکن زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اب اس لغت کا زمانہ بھی گزر چکا ہے۔ اس میں دئے ہوئے تلمیحی واقعات کی نہ پوری تفصیلات ہیں اور نہ علمی تحقیق۔ نہ مثالوں کا التزام ہے اور نہ آخذ کا حوالہ۔

اب ہماری زبان ترقی کی ان منزلوں تک پہونچ چکی ہے کہ اس میں محض روایتی تفصیلات سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ مثلاً فرعون و موسیٰ کی تلمیح کے سلسلہ میں ہم کو اب یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ والے فرعون کا کیا نام تھا، اس کے زمانہ میں مصر کی تہذیب کیا تھی اور وہ لوگ کس مذہب کے پیرو تھے؟ ان لوگوں میں فرعون کا درجہ کیا تھا؟ وہ کیوں اور کیسے غرق ہوا؟ غرق فرعون کی تاریخی اسناد کیا ہیں؟ اسی قسم کی بہت سے تشریحات مع اسناد کے ہر تلمیحی واقعہ کے لئے اب ضروری ہیں۔ بہرحال ایک جامع فرہنگ تلمیحات کی ضرورت ہمارے یہاں عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے۔

(۱) تلمیحات کے ساتھ ساتھ آخذ کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

(۲) روایات مذہب سے تعلق رکھنے والی تلمیحات کو بالکل اسی طرح نقل کر دیا ہے جس طرح وہ مشہور ہیں۔

(۳) ادبی اور عام تلمیحات میں مشہور واقعہ کے ساتھ ساتھ محققین کی علمی تحقیق بھی دی گئی ہے۔

(۴) ہر تلمیح کے لئے مثالوں کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں صرف اساتذہ کے کلام کو جگہ دی ہے، جن تلمیحات کے لئے اشعار نہ مل سکے، ان کے لئے مستند مصنفین کے فقروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۵) جدید تلمیحات کو بھی جمع کیا گیا ہے اس میں وہ تمام مشہور واقعات بھی شامل ہیں جو ہماری آنکھوں دیکھتے پیش آتے ہیں۔

(۶) اسلامی تلمیحات کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی مذاہب کی وہ تمام تلمیحات جمع کی گئی ہیں جن کا استعمال اُردو زبان میں عام طور پر ہوتا ہے۔

(۷) ان تمام تلمیحات کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق ہندوستان اور دیگر ممالک کے رسم و رواج۔ اعتقاد و اوہام اور قصے کہانیوں سے ہے۔

(۸) بہت سے اساتذہ کی استعمال کی ہوئی مخصوص تلمیحات بھی جمع کی گئی ہیں۔

(نگار) یہاں تک تو جناب محمود نیازی نے صرف فرہنگ تلمیحات کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے، لیکن اس کے آگے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس تلمیحات کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون میں کیا ہے وہ پانچ سال کی انتہائی سعی و کاوش کے بعد انھوں نے مرتب بھی کر لی ہے۔

یہ مسودہ چار پانسو صفحات کے دو حصوں پر مشتمل ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر ہندوستان یا پاکستان کا کوئی پبلشر اس کی اشاعت کے لئے آمادہ ہو جائے۔

(نیاز)

آبِ حیات - تذکرہ یا تاریخ

(اقرار احمد عباسی)

آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد کا تاریخی کارنامہ جو ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوا، بیک وقت چند ایسی خصوصیات کا حامل ہے کہ اس کو صرف صنفِ ادب سمجھنا بے انصافی ہوگی۔ وہ ایک ہی وقت میں تذکرہ بھی ہے، تاریخ بھی، اور انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ جو لوگ اس کے ماحول سے ہٹ کر سخت تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں وہ اس میں صرف تذکرہ نگاری کا نیا انداز پاتے ہیں، جو لوگ تاریخی شعور رکھتے ہیں اور اس کے ماحول سے باخبر ہیں وہ اس کو تاریخی حیثیت دیتے ہیں اور جو اس کی رنگیں بیانی، شوخی، لطیفوں اور چٹکلوں سے متاثر ہوتے ہیں وہ اس کو ادبی کارنامہ تصور کرتے ہیں۔

پروفیسر شرانی نے اپنے خاص انداز میں اس کی خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے:-

"اردو کیا فارسی میں بھی اس پائے اور انداز کی کوئی کتاب نہ ہوگی۔ اردو میں فارسی کا مزہ، سادہ نثر، چھوٹے چھوٹے فقرے، ہلکی رنگ آمیزی، عبارت کا ہائکپن، مضمون کی شوخی، لطیفوں اور چٹکلوں کی بھرمار، تاریخ میں افسانہ کا ڈھنگ، نثر میں نظم کا مزہ ایسی خصوصیات ہیں جو ہر شخص کو گرویدہ کر لیتی ہیں۔"

اجمالی طور پر اس کی خصوصیات اس اقتباس سے واضح ہو جاتی ہیں۔ آبِ حیات کی ادبی حیثیت تو مسلم ہے۔ دراصل آزاد کی اس رنگین بیانی، تخیل کی بلند پروازی اور خاص طرزِ ادا نے اس کے تاریخی اور تنقیدی شعور پر پردہ سا ڈال دیا ہے یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس عہد کے تقاضوں نے ہر صاحبِ فکر و بصیرت کو ادب کی افادیت پر غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں ایک کو دوسرے کا پیشرو کہنا کچھ مناسب نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہو یا اس کے خیالات و عقاید کو دوسرے ہم خیال لوگوں سے تقویت پہونچی ہو۔

آبِ حیات کی صحیح اہمیت کی وضاحت کے لئے ہمیں سرسری نظر اس کے ماحول اور پس منظر پر بھی ڈالنی چاہئے۔ آزاد سے قبل بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ خان آرزو اور سودا کے تذکرہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میر کے تذکرہ "نکات الشعراء" کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے بعد چند تذکرے اس کے جواب میں لکھے گئے جن کا مقصد میر کے اقوال و آرا کی تردید تھی، ان کا انداز مخالفانہ ہے۔ اس میں گردیزی کا تذکرہ اور قاسم کا تذکرہ "مجموعۂ نغز" خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد قائم، میر حسن اور مصحفی نے تذکرے لکھے جو اپنے مقام پر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ "گلزار ابراہیم" "گلشنِ ہند" (خلاصہ گلزار ابراہیم) اور گلشنِ بیخار وغیرہ بھی قابلِ تذکرے ہیں، لیکن یہ تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے، اس کے علاوہ گارساں دتاسی نے بڑی کاوش اور تحقیق کے بعد فرانسیسی زبان میں بھی ایک تذکرہ لکھا۔ ان تذکروں پر سرسری نظر ڈالنے سے چند باتیں واضح شکل میں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً ان تذکروں میں تاریخی ترتیب کا خیال نہیں واقعات کی تحقیق پر زور نہیں دیا جاتا۔ تنقیدی شعور کا فقدان ہوتا ہے۔ تنقید بلکہ رائے مبہم، رسمی اور محدود الفاظ میں دی جاتی ہے۔ شعراء کا ذکر حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ گارساں دتاسی جیسا صاحبِ نظر جو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب پر اعتراض کرتا ہے جب اردو شعراء کا تذکرہ خود لکھنے بیٹھتا ہے تو حروفِ تہجی کی روایتی ترتیب قایم رکھتا ہے۔

اگرچہ اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہ تھا بلکہ مواد اور ذرائع کی نایابی کی بنا پر وہ اس رسمی دستور کو قایم رکھنے پر مجبور تھا۔

یہی در اصل تذکرہ اور تاریخ کا فرق ہے۔ یہی تذکرہ کی خصوصیات تاریخی کارنامے کے عیوب ہیں۔ ان کے پیشِ نظر آبِ حیات کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد نے بڑی حد تک "آبِ حیات" کو ان عیوب سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ خود اپنی جگہ کس حد تک کامیاب رہے۔ "آبِ حیات" اُس تذکرہ نگاری کی اعلیٰ ارتقائی اور ترقی یافتہ شکل ہے جس کا آغاز بیاضوں سے ہوتا ہے۔ جس میں ابتداءً حروف ذاتی پسند کے مطابق کلام کا انتخاب ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ شعراء کے حالات درج ہونے لگے۔ شاعری کی ترقی اور شعراء کی کثرت نے ان کے کلام اور حالات محفوظ کرنے کی ترغیب دی۔ اس طرح تذکرہ نویسی وجود میں آئی جس کو آزاد نے اس کی آخری منزل تک پہونچایا اور لوگ "آبِ حیات" کو اُردو شاعری کی تاریخوں میں شمار کرنے لگے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد نے "آبِ حیات" میں تاریخی ترتیب کا خاص خیال رکھا۔ اس ترتیب کی کامیابی کے لئے ادوار قایم کئے اگرچہ اس سے قبل قایم اور میر حسن نے بھی اپنے تذکروں میں ادوار قایم کئے تھے۔ لیکن آزاد نے چند نئے اصول اور تاریخی خصوصیات کو مدِ نظر رکھ کر اُردو شاعری کے پانچ ادوار قایم کئے۔ حالانکہ یہ تقسیم بھی سطحی ہے اور کہیں کہیں تاریخی غلطی بھی سرزد ہوئی ہے۔ آزاد، دلی سے شعراء کا آغاز کرتے ہیں اگرچہ اس سے قبل اُردو شاعری کا ایک پورا دور گزر چکا ہے جو آج دکنی دور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمی کا الزام آزاد کے سر اتنا نہیں جتنا کہ ان کے زمانہ کے سر ہے اس زمانہ میں ولی اور گنتی کے چند شاعروں کے کچھ اشعار کے علاوہ دکنی شاعری سے شمالی ہند بالکل ناواقف تھا اس کے علاوہ خان آرزو کو دوسرے دور میں شمار کرنا تاریخی ترتیب کی غلطی ہے۔

واقعات کی تحقیق، صداقت اور شعراء کے حالات کے متعلق آزاد نے اپنا نظریہ دیباچہ میں پیش کیا ہے وہ قدیم تذکروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان تذکروں میں شعراء کی زندگی کے حالات نہ تفصیل سے ملتے ہیں اور نہ صحیح ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ولادت اور وفات کی سنوں کا علم تک نہیں ہوتا۔ کسی شاعر کے متعلق تذکروں سے ہمیں پوری معلومات نہیں ملتی اس کمی کی وجہ سے ہم کسی شاعر کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کر سکتے۔ یہ اور اس قسم کے اعتراضات کرتے ہوئے اپنے متعلق فرماتے ہیں :۔ "اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ان کی زندگی کے حالات اس طرح بیان کئے جائیں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو"

جہاں تک تحقیق کا معاملہ ہے خارجی شواہد سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے تحقیق و تفتیش میں کافی کاوش اور کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اکثر ان سے اس معاملہ میں لغزش بھی ہوئی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں معلومات کے ذرائع محدود تھے دوسری وجہ یہ کہ آپس کی رقابت اور معاصرانہ چشمک نے بعض غلط واقعات فراہم کر دیتے تھے۔ اس وقت معلومات کا ایک بڑا ذریعہ قدیم تذکرے بھی تھے۔ لیکن جیسا کہ سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اکثر تذکرے ایک دوسرے کے جواب بلکہ تردید میں لکھے جاتے تھے۔ "نکات الشعراء" کے جواب میں چند تذکرے لکھے گئے جن میں گردیزی اور قاسم کا تذکرہ بہت اہم ہے۔ پروفیسر شیرانی کا تذکرہ "مجموعۂ نغز" کی بنا پر ہے اور آج "نکات الشعراء" کے آنے سے اس اعتراض میں سنگینی ہو جاتی ہے، اکثر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ آزاد نے واقعات کے بیان میں صرف خیالی طوطا مینا سے کام لیا ہے اکثر بے بنیاد باتوں کو دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اپنے خاص رنگین اور شوخ انداز میں پیش کر دیا ہے اور پڑھنے والا بجائے تاریخی واقعات پر غور کرنے کے ان لطیفوں اور چٹکلوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے شاید اس بات کے پیشِ نظر علامہ شبلی نے کہا ہے "آزاد 'آبِ حیات' میں صرف گپیں" لڑاتے ہیں جہاں حقایق اور واقعات کی صداقت سے کوئی سروکار نہیں ہر جگہ تخیل کی کارفرمائی ہے لیکن میں یہاں بلا خوف تردید

کہہ سکتا ہوں کہ آزاد اس تخیل کی پرواز میں بعض ایسے گوشوں تک ہمیں لے جاتے ہیں جن کی اہمیت مسلّم ہے اور جو ہمیں دوسرے پہلوؤں پر مجبور کرتے ہیں۔ آزاد پر ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ذاتی اور مذہبی عقاید کی بنا پر کہیں کہیں جانبداری سے بھی کام لیا ہے جس کی وجہ سے یا تو بعض شعراء کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا صرف لاپرواہی سے اجمالی طور پر ذکر کر کے ان کی بہت غلط نمایندگی کی ہے مثلاً مومن کی۔

اِن تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود یہاں میں ایک تاریخی صداقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آزاد ایک تنقیدی شعور (گہرا یا سطحی) رکھتے تھے۔ اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ وہ تنقیدی شعور حالی اور شبلی سے بہت پہلے بیدار ہو چکا تھا اس کی زندہ مثال لاہور کا ۱۸۷۴ء کا مشاعرہ ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا جس نے اُردو میں مربوط، وسیع، واقعاتی، خارجی اور فطری شاعری کا آغاز کیا۔ اگر محض سنہ وار مطالعہ کیا جائے تو ہم پر یہ اثر ہوتا ہے کہ حالی اور شبلی کا تنقیدی شعور اسی آزاد کے تنقیدی شعور کی تکمیل تھی۔ آزاد نے "نیرنگ خیال" کے دیباچہ میں اپنا نظریہ شعر و ادب پیش کیا ہے۔ جس سے ہم اُن کے تنقیدی شعور کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شعر و شاعری کی ضرورت، اس کی روح اور ماہیت، سماج سے شاعری کا تعلق اور افادیت، شاعری کا مقصد، اور شعر و شاعری کے اُصول، یہ اور اس قسم کے ہنگامی سوالات جو حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں اُٹھائے ہیں اور ان کے متعلق چند اصول اور قاعدے مرتب کر کے ان پر شعر و ادب کو پرکھا ہے اور اس کے بعد اصلاحی پہلو بھی پیش کئے ہیں۔ ہمیں 'آبِ حیات' میں نہیں ملتے۔ آزاد کا نظریۂ ادب مندرجۂ ذیل اقتباسات سے واضح ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ہمیں اس فخر کے ساتھ یہ نہیں بھولنا کہ ان لوگوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور اپنے رنگ میں کھلتا مفت ہاتھوں سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت۔ نازک خیال اور باریک بین لوگ تشبیہ، استعارہ اور مناسبتِ لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔ اور اظہارِ اصلیت سے لاپرواہ ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کا رنگ بگڑ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فارسی کی طرح اُردو میں "پنج رقعہ" "نسائہ عجائب" وغیرہ تو ملتے ہیں لیکن ایسی چیز نہیں ملتی جس میں سچی تصویریں ہوں۔ واقعہ کو اس طرح بیان نہیں کیا جاتا کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ یہ واقعہ اس طرح ممکن تھا اور یہ تو ناممکن ہے کہ فلسفہ اور حکمت و اخلاق کا اظہار ہو سکے۔ جس کی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد اظہار افسوس کرتے ہیں کہ اس طرح "زبان کا جوہر خاک میں مل گیا اور آج ہم انگریزی کے تراجم اُردو میں کرنے سے قاصر ہیں" اس طرح تنقید کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مشورہ دیتے ہیں:-

"آنکھوں سے دیکھ کر جو دل پر گزرتی ہے اس کو دل ہی جانتا ہے لیکن اس کو اسی طرح کیوں نہیں ادا کر دیتے کہ سننے والا کلیجہ پکڑ کر رہ جائے۔"

ان اقتباسات سے آزاد کا نظریۂ شاعری واضح ہو جاتا ہے۔ ان نظریات کے پیشِ نظر آزاد نے مختلف ادوار قایم کئے اور کلام کو پرکھنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ آزاد اپنی نظریاتی تنقید کو عملی تنقید میں بہت کم نباہ سکے۔ غالباً اسی لئے بعض نقاد دل کو آزاد کے یہاں تنقیدی شعور کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ آزاد کے یہاں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات کی تائید میں مختلف مثالوں سے دلایل پیش نہیں کرتے۔ مختلف ادوار کی تمہید میں زمانہ کی، ماحول کی، اور شعرا کی مخصوص خصوصیات پر نظر ڈالتے ہوئے خارجی اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور شاعری پر اس کے اثرات بھی واضح کرتے ہیں۔

ابتدائی تین ابواب اپنی انشائی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتے ہیں حالانکہ اس سلسلہ میں بہت سے بیانات سطحی اور موجودہ تحقیق

کی روشنی میں بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں۔ مثلاً پہلے باب کی پہلی سطر اس طرح شروع ہوتی ہے "جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے جس کی عمر آٹھ سو برس ہے اور جس کی ماں سنسکرت ہے" ظاہر ہے کہ اردو کا ماخذ آج متفقہ طور پر کھڑی بولی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پھر آزاد نے سنسکرت اور برج کے اثرات اردو پر، اور سنسکرت اور فارسی کا قدیم ترین تعلق ظاہر کیا ہے اردو شاعری میں ایہام کو برج کے اثر کا نتیجہ بتایا ہے۔

مختلف شعراء کے کلام پر آزاد کی تنقیدی رائے اپنے مخصوص انداز میں ہونے کے باوجود اپنے اندر لچک وزن رکھتی ہے۔ اس تنقید میں وضاحت تو بے شک کم ہے۔ انتہائی اختصار سے کام لیا ہے لیکن عام تذکرہ نگاروں کی طرح مخصوص اور مبہم الفاظ میں نہیں ہے۔ محض اصطلاحوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ نہایت سچی تلی رائے دیتے ہیں۔ سودا کی ہجو نگاری کے متعلق کہتے ہیں:-

"جب کسی پر بگڑے تو فوراً پکار اٹھے ارے غنچہ لا تو قلمدان ذرا میں اس کی خبر لوں۔ مجھے سمجھا کیا ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے۔ عالم، جاہل، نیک، بد کسی کی داڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی"

یا غالب کے کلام پر رائے۔ ان کے فارسی کلام کو ترجیح وغیرہ۔ البتہ اپنے استاد ذوق پر تبصرہ کرتے ہوئے غرور حد سے تجاوز کر گئے اور حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تمام بحث کو ہم اس نتیجہ پر ختم کرتے ہیں کہ آزاد نے تاریخ کو نئے راستے پر ڈالا اور تنقیدی شعور بیدار کرنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا یا جو حالی، شبلی تک بالغ ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس طرح 'آبِ حیات' کو تذکرہ کی آخری سیڑھی یا منزل اور تاریخ کی پہلی سیڑھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یا بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ آزاد نے 'آبِ حیات' کے ذریعہ تذکرہ نویسی کو تاریخ نگاری کی راہ پر ڈالا اور اس طرح 'آبِ حیات' جمیع معنوں میں اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہے۔

مکتبۂ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی خوبیوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمائیے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں ان کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے کمیشن وی پی کا کوئی سوال نہیں، لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بحساب پندرہ فیصدی آپ کو بھیجنا چاہئے۔ منیجر نگار لکھنؤ

حیات محمد	(محمد حسین آزاد)	اٹھ روپیہ	جینے کی راہ	(لین پول)	بارہ روپیہ
ابوبکر صدیق	(")	دس روپیہ	زندگی کا راستہ	(ڈیوس ہیپر)	چھ روپیہ
الحسین	(")	ڈھائی روپیہ	کامیابی کا راستہ	(")	چار روپیہ
الزہرا	(")	دو روپیہ	دلی سے آگرہ تک	(سید عبداللہ)	پانچ روپیہ
انہار دین	(")	پانچ روپیہ	مقدمہ شعر و شاعری	(ڈاکٹر وحید قریشی)	دس روپیہ
خالد سیف اللہ	(ابوزید شبلی)	پانچ روپیہ	تذکرۂ شوق	(عطاء اللہ پالوی)	چھ روپیہ
عمرو بن العاص	(مسز ابراہیم علی)	پانچ روپیہ	پھندنے	(صفدر حسین نقوی)	پانچ روپیہ
چنگیز خاں	(ہیرلڈ لیمب)	پانچ روپیہ	گنج فرشتے	(")	پانچ روپیہ
امیر تیمور	(")	پانچ روپیہ	نمکدان آگرہ	(")	تین روپیہ
جینے کا قرینہ	(آندرے موروا)	چھ روپیہ	چغد	(")	تین روپیہ

تکملۂ رُباعی

(سحر عشق آبادی)

"رُباعی" یوں تو زبانِ تازی کا لفظ ہے لیکن اس کا انضباط فارس کے مشہور شاعر رودکی نے کیا اور اس کے اوزان کی تنظیم اس طرح فرمائی:-

صدر و ابتدا	حشو		عروض و ضرب
اخرب	مکفوف یا مقبوض	مکفوف	مجبوب یا اہتم
مفعولُ	مفاعیلُ یا مفاعلن	مفاعیلُ	فعَل یا فعول

نقشہ مذکورہ کی رو سے رُباعی کے مخصوص زحاف پانچ ہوئے۔ خرب۔ کف۔ قبض۔ جب اور ہتم چھٹا زحاف تسکین اوسط ہے جسکے فیض سے کُل چوبیس شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں مگر ترتیب اوزان کی شرط یہ ہے ع

"سبب پئے سبب است و وتد پئے وتد است"

اب میں چوبیس اوزان کو صرف چھ زحافوں کے ذریعہ بنا کر ذیل میں مس کرتا ہوں:-

1 -	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعَل	9 -	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیل	فعول
2 -	〃	〃	مفاعیلن	فع	10 -	〃	〃	مفاعیلن	فاع
3 -	〃	مفاعیلن	مفعولُ	فعَل	11 -	〃	مفاعیلن	مفعولُ	فعول
4 -	〃	〃	مفعولن	فع	12 -	〃	〃	مفعولن	فاع
5 -	مفعولن	فعولُ	مفاعیلُ	فعَل	13 -	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعول
6 -	〃	〃	مفاعیلن	فع	14 -	〃	〃	مفاعیلن	فاع
7 -	〃	مفعولن	مفعولُ	فعَل	15 -	〃	مفعولن	مفعولُ	فعول
8 -	〃	〃	مفعولن	فع	16 -	〃	〃	مفعولن	فاع

ذیل کے آٹھ اوزان وہ ہیں جن کے مصرعوں کا دوسرا رکن مقبوض (مفاعلن) ہے۔

17 -	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعَل	21 -	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعول
18 -	〃	〃	مفاعیلن	فع	22 -	〃	〃	مفاعیلن	فاع
19 -	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعَل	23 -	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعول
20 -	〃	〃	مفاعیلن	فع	24 -	〃	〃	مفاعیلن	فاع

ان چوبیس اوزان کا حصار حضرت رودکی نے کیا ہے اور قید لگائی ہے کہ جو رُباعی ان چوبیس اوزان سے باہر ہو وہ رُباعی ہرگز نہیں۔

لیکن خواجہ امام حسن قطان خراسانی نے انھیں جو بیس اوزان کے گیارہ زحاف گڑھ کر دو دائروں کا گورکھ دھندا بنایا جس میں ہر عروضی آج تک اُلجھا ہوا ہے حالانکہ محقق طوسی نے لاکھ سمجھایا کہ رُباعی کے صدر و ابتدا میں رکنِ اخرام نہیں آتا۔

کیا میں دورِ حاضر کے عروضیوں سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اوزانِ رُباعی میں مندرجۂ ذیل ارکان کی کیا ضرورت ہے؟ جب صرف چھ زحافوں سے کام نکل سکتا ہے؟ اخرم (مفعولن) مخنّق (مفعولن) سالم (مفاعیلن) اشتر (فاعلن) ازل (فاع) اور مخنّق مجبوب (فع) — یہ ارکان بظاہر سالم و اشتر وغیرہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ سب تسکین اوسط سے بنے ہیں اور انھیں مُسکّن کہنا چاہئے۔

صدر و ابتدا	(مفعولُ مفاعیلُ) اخرب و مکفوف مُسکّن	= مفعولن مفعولُ
	(مفعول مفاعلن) اخرب و مقبوض مُسکّن	= مفعولن فاعلن
عروض و ضرب	(مفاعیلُ فعَل) مکفوف مجبوب مُسکّن	= مفاعیلن فع
	(مفاعیلُ فعول) مکفوف اہتم مُسکّن	= مفاعیلن فاع
حشو	(مفاعیلُ مفاعیلُ) ہر دو مکفوف مسکّن	= مفاعیلن مفعولُ
مصرع	(مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعَل) اخرب مکفوف مجبوب مُسکّن (مفعولن مفعولن مفعولن فع)	

یہاں تک تو رُباعی کے ان چوبیس اوزان کا بیان ہوا جو رودکی معفور نے منضبط کئے تھے۔ اب اُن اوزان کا ذکر کرتا ہوں جو حضرت رودکی کے مقررہ اصول کے تحت ایزاد ہو سکتے ہیں۔

اس وقت تک مصرع رُباعی کے حشو کا پہلا رکن مقبوض (مفاعلن) تسلیم ہے (مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول) اس مقام پر سوال یہ ہوتا ہے کہ حشو کا دوسرا رکن مقبوض کیوں نہیں ہو سکتا؟ بقول حضرت نیاز فتحپوری عروض استقرائی علم ہے وحی نہیں۔

جب آپ اس سوال پر غور فرمائیں گے تو عقلِ سلیم یہی جواب دے گی کہ ہاں ہو سکتا ہے۔

جب ہو سکتا ہے تو مندرجۂ ذیل بارہ اوزان شامل کر کے کیوں نہ رُباعی کے ۳۶ اوزان مقرر کر لئے جائیں؟

نئے اوزان

25	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعَل	31	مفعول	مفاعلن	مفاعلن	فعول
26	مفعولن	"	فاعلن	"	32	مفعولن	فاعلن	"	"
27	مفعولُ	مفاعیلُ	"	"	33	مفعولُ	مفاعیل	"	"
28	"	مفاعیلن	فاعلن	"	34	"	مفاعیلن	فاعلن	"
29	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	"	35	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	
30	"	مفعولن	فاعلن	"	36	"	مفعولن	فاعلن	

اگر آپ تاریخی، مذہبی معلومات چاہتے ہیں تو یہ لٹریچر پڑھئے

خدا نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ تنقیح اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ فرمانروایانِ اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
علوم اسلام و علماءِ اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ جوبلی نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔
یہ پانچوں نمبر ایک ساتھ آپ کو معہ محصول بیس روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ قیمت آپ پیشگی ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

نماز کے اوقات

(سید عبدالکریم صاحب - مرزاپور)

نماز اس میں شک نہیں بڑی اچھی چیز ہے، لیکن موجودہ زمانہ کی مشغول زندگی میں جبکہ اکثر کام کرنے والے مصروف کار رہتے ہیں پانچ وقت کی پابندی میرے خیال میں قابل عمل نہیں۔ شیعہ حضرات نے یہاں بے شک کچھ آسانی ہے کہ انھوں نے اوقات نماز میں کمی کرکے پانچ سے تین کردیں اور ادائے نماز کے اوقات بھی مناسب لکھے۔

مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید میں پانچ نمازوں کا ذکر نہیں ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ میں میری رہبری کرسکتے ہیں۔

(نگار) کلام مجید میں ۷۵ جگہ لفظ صلوٰۃ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن وہ آیات جن سے اوقاتِ صلوٰۃ پر روشنی پڑتی ہے صرف چار ہیں۔ سورۂ نور۔ سورۂ ہود۔ سورۂ بقر۔ سورۂ اسرائیل۔

۱- سورۂ ہود کی آیت یہ ہے:- "اقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفاً من اللیل"

نماز ادا کرو، دن کے دونوں وقت اور شب کے اوقات میں۔

زُلفۃ کے معنی قریب ہونے کے ہیں اس لئے زلفۃ اللیل کے معنی ہوں گے آغاز شب کے۔ لیکن یہاں زُلفا کہا گیا ہے جو جمع ہے زلفۃ کی اس لئے اس میں ایک بار سے زاید ادائے صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے لیکن دن میں اوقات کی تعیین نہیں کی گئی۔ یہ سورت مکی ہے، لیکن مقاتل کا خیال ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔

"طرفی النہار" یعنی دن کے دونوں کناروں سے کیا مراد ہے، نہار عربی میں کہتے ہیں طلوع سحر یا طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب یا شام کے جھٹپٹے ہونے تک کا وقت۔ اس لئے طرفی النہار کے ایک کنارے سے نماز فجر تو ثابت ہوگئی۔ اب رہی دوسرے کنارے کی تعیین سو اس کے سمجھنے میں ہمیں "زلفا من اللیل" سے مدد لینا چاہئے۔ چونکہ لیل غروب آفتاب کے بعد شروع ہوجاتی ہے اس لئے زلفا من اللیل میں جو ایک سے زاید بار ادائے نماز کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ رات کی نمازوں میں مغرب و عشاء کے سوا کوئی اور نماز نہیں ہوسکتی۔

پھر جب رات کی نمازوں کی یہ تعیین ہوگئی تو طرفی النہار کے دوسرے کنارہ کی نماز فجر عصر ہی ہوسکتی ہے۔

۲- سورۂ بنی اسرائیل کی آیت یہ ہے:- "اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر" (نماز ادا کرو سورج ڈھلنے سے لے کر رات ہوجانے تک اور نماز فجر)

دلوک شمس کہتے ہیں سورج ڈھل جانے کو۔ اور غسق اللیل کہتے ہیں رات کے ابتدائی حصہ کو اس لئے اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے

کہ سورج ڈھلنے کے بعد رات تک نماز ادا کرو - ظاہر ہے کہ اس کے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ سورج ڈھلنے کے بعد رات تک برابر نماز ہی پڑھتے رہو - یقیناً وقت کی تعیین پیشِ نظر ہو گی جس کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس صورت میں ظہر یا عصر دونوں میں سے کوئی ایک نماز ہو سکتی ہے

۳- سورۂ بقرۃ کی آیت ہے :- "حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ" - (پابند ہو نمازوں کے اور نماز وسطیٰ کے)

وسطیٰ کہتے ہیں درمیانی چیز کو اور اسی لئے ہاتھ کی پانچ انگلیوں میں سے درمیانی یا بڑی انگلی کو بھی وسطیٰ کہتے ہیں، لیکن یہاں صلوٰۃ وسطیٰ سے کون سی نماز مراد ہو سکتی ہے، اس کا صحیح حال اسی وقت معلوم ہو سکتا تھا جب اوقات نماز کی صراحت موجود ہوتی۔ (یعنی اگر صراحت نماز دہ پانچ وقت کی ہوتی تو ہم تیسرے وقت کی نماز کو اور اگر تین وقت کی ہوتی تو ہم دوسرے وقت کی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ کہہ سکتے تھے) لیکن چونکہ اوقات کی صحیح تعیین نہیں پائی جاتی ہے اس لئے صلوٰۃ وسطیٰ کی بھی صحیح تعیین دشوار ہے۔

۴- سورۂ نور کی آیت کا براہ راست تعلق تو اوقات نماز سے نہیں ہے لیکن ضمناً صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر آ گیا - اس آیت میں لوگوں سے ملنے کے اوقات رسول اللہ کو بتائے گئے ہیں کہ مناسب وقت لوگوں سے ملنے کا نماز فجر سے پہلے، اور نماز عشاء کے بعد کا ہے یا درمیان میں دوپہر کے وقت -

---

ان تمام آیات سے فجر اور عشاء کی نمازیں تو سورۂ ہود اور سورۂ نور کی آیات سے متعین ہو جاتی ہیں، البتہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کی صحیح صحیح تعیین آیات قرآنی سے نہیں ہوتی، لیکن سورۂ ہود کی آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ دوپہر ڈھلے کے بعد شام تک کم از کم ایک نماز تو یقیناً فرض ہے اور بعد غروب آفتاب دو نمازیں (مغرب و عشاء)

..... اب رہ گئی نماز ظہر و عصر سو سورۂ ہود کی طرفی النہار والی آیت سے دوسری طرف کی نماز غالباً نماز عصر مراد ہو گی (کیونکہ بعض احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے - اب رہ گئی نماز ظہر سو اس کا تعلق نہ طرفی النہار سے ہے، نہ غسق اللیل سے ..

قرآنِ پاک کی آیات سے اوقات نماز کی تعیین جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے - رہی حدیثیں سو ان کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ ان میں باہمد گر اتنا اختلاف ہے کہ ان سے بھی ہم کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے - اوقات نماز کیا خود طریق نماز میں بھی سب ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں - اور آج تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ رسول اللہ کس طرح نماز ادا کرتے تھے - کوئی کہتا ہے وہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے، کوئی کہتا ہے ہاتھ باندھ کر - کوئی ان سے آمین بالجہر ثابت کرتا ہے، کوئی آمین بالخفا - یہی صورت اوقاتِ نماز کی ہے -

لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو اس تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر آپ نماز کو اچھا سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا ہے تو پڑھئے، پانچ وقت نہ سہی، ایک ہی وقت سہی - پڑھئے تو -

---

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ رسالے پڑھئے

اصناف سخن نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول - حسرت نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول - مومن نمبر قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔
ریاض نمبر = قیمت دو روپیہ علاوہ محصول - داغ نمبر = قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول - (جلد ختم ہو رہی ہے)
لیکن یہ سب آپ کو بیس روپیہ میں معہ محصول مل سکتے ہیں اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں -

منیجر نگار لکھنؤ

نظیر صدیقی

یہ انسان

(انشائیہ)

کسی صحبت میں انسان کی آفرینش پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں جب ایک صاحب نے کہا کہ انسان حضرت آدم کی نسل سے ہے تو ایک سیدھا سادہ نوجوان بول اُٹھا:۔ "لیکن ہمارے ابا جان تو کہہ رہے تھے کہ انسان بندر کی نسل سے ہے"۔ اس پر ایک بزرگ نے اس نوجوان کو ڈانٹ بتاتے ہوئے فرمایا:۔ "میاں صاحبزادے! خاموش رہو۔ یہاں گفتگو انسان کے بارے میں ہو رہی ہے نہ کہ تمہارے خاندان کے بارے میں"۔

اس جواب سے ارباب محفل نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ بندر کے مقابلہ میں اپنی برتری کے احساس سے مسرور بھی۔ مجھے ٹھیک نہیں معلوم کہ انسان حضرت آدم کے خاندان سے ہے یا بندر کی نسل سے۔ لیکن میں کچھ ایسا محسوس کرتا رہا ہوں کہ اگر انسان، بندر کی نسل سے نہیں ہے تو شاید یہ بات خود انسان کے لئے اتنی باعث فخر نہیں جتنی بندر کے لئے اگر بندر انسان جیسی بدنصیب اور بے وقوف مخلوق کا مورثِ اعلیٰ نہیں تو اس میں اس کا کیا نقصان؟

انسان بڑا خود فریب اور خدا پرست واقع ہوا ہے۔ اس نے خدا کو ماننے اور منوانے کے لئے ایسے ایسے دلایل تراشے ہیں کہ اس کی خدا پرستی بھی خود فریبی کی ایک شکل بن کر رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ تو جان بوجھ کر اس خود فریبی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ خود فریبی انسان کی عادت نہیں ضرورت بن چکی ہے۔ اسی ضرورت نے ایک مرتبہ کسی فلسفی سے کہلوایا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا پیدا کر لینا چاہئے۔ خدا کے وجود کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت محروم و مظلوم انسانوں کی تسکین اور اسرار کائنات کی توجیہ آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انسان نے ایک نہیں سیکڑوں خدا پیدا کر لئے۔ اب سوچنے والوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ انسان کا خالق خدا ہے یا خدا کا خالق انسان۔

خدا کے وجود کا مسئلہ بڑی حد تک شیکسپیر کے ڈراموں کے مسئلہ سے مشابہ ہے۔ مہذب انسان اتنی مدت سے اتنی عقیدت اور ارادت کے ساتھ شیکسپیر کی پرستش کرتا آرہا ہے کہ اب قدرتی طور پر اس کا جی نہیں چاہتا کہ شیکسپیر کے ڈرامے کسی اور کے ثابت ہوں۔ اسی طرح خدا کے وجود پر انسان کا ایمان اتنی مدت سے چلا آرہا ہے کہ یہ ایمان انسان کے شعور کا جزو بن چکا ہے۔ اس صورتِ حال کا نفسیاتی تقاضا یہ ہے کہ اگر خدا کا وجود نہیں ہے تو کبھی اس کا نہ ہونا ثابت نہ ہو۔

خدا کی خوبی اور انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جس طرح انسان خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا اسی طرح وہ اس کے عدم وجود کو بھی ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ جتنے مضبوط دلایل اس کے وجود کے ثبوت میں فراہم کئے گئے ہیں اتنے ہی مؤثر دلایل اس کے عدم وجود کے ثبوت میں بھی پیش کئے گئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ خدا کا وجود عقل کی بجائے عقیدے کا معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔ اگر مانو تو سب کچھ۔ نہ مانو تو کچھ بھی نہیں۔ اس عقیدے پر عقل کے حملے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اب تک عقیدہ ہمیشہ عقل پر غالب رہا ہے۔ مستقبل میں کیا ہوگا۔ کون جانے۔

خدا کو مان لینے سے انسان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں - نہ ماننے سے اندیشوں میں اضافہ ہو جاتا ہے - خدا کو ماننے کے لئے عقل کا کمزور اور عقیدے کا مضبوط ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے - نہ ماننے کے لئے عقیدے کا کمزور اور عقل کا مضبوط ہونا ضروری نظر آتا ہے عقیدہ انسان کو اور کچھ دے یا نہ دے سکون ضرور عطا کرتا ہے - عقل انسان سے اور کچھ لے یا نہ لے سکون ضرور چھین لیتی ہے - یہی وجہ ہے کہ انسان کو عقل کے مقابلہ میں عقیدہ کا سودا زیادہ پسند رہا ہے -

انسان کی ایک آفاقی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہر انسان جوانی میں عیاشی کرتا ہے اور بڑھاپے میں عبادت - جو لوگ اپنی جوانی کو عبادت میں ضایع کرتے ہیں وہ اپنے بڑھاپے کو عیاشی سے خالی نہیں جانے دیتے، عیاشی اور عبادت انسان کے دو ایسے جسمانی اور روحانی امراض ہیں جن کا علاج ابھی تک سائنس بھی نہیں دریافت کر سکی ہے -

دُنیا کے ہر ملک میں انسان نے دوسروں کے حملوں سے اپنی حفاظت کے لئے قوانین بنا رکھے ہیں - ہر قانون کے کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں - ہر انسان چاہتا یہ ہے کہ مستثنیات اس کے لئے ہوں اور قوانین دوسروں کے لئے -

انسانی تاریخ کی بہت سی تعبیریں پیش کی گئی ہیں - میں ان تعبیروں کی تردید نہیں کرنا چاہتا - البتہ ان میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کی تاریخ جرأت اور حماقت کی تاریخ ہے - ویسے جرأت اور حماقت میں کچھ زیادہ فرق نہیں - ہر وہ جرأت جو ناکام رہتی ہے حماقت کہلاتی ہے اور وہ حماقت جو کامیاب ہو جاتی ہے جرأت تصور کی جاتی ہے -

انسان ہمیشہ حق و باطل کے جھگڑوں میں گرفتار رہا ہے - یہ جھگڑے آج تک ختم نہ ہو سکے - البتہ ان جھگڑوں کی بدولت ہر دور میں بے شمار انسانوں کا خاتمہ ضرور ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا کیونکہ انسان کے ذہن میں حق و باطل کا تصور یہ رہا ہے کہ اگر جیت اپنی ہو تو وہ حق ہے اور اگر دوسروں کی ہو تو باطل - ظاہر ہے کہ جیت اپنی ہو یا دوسروں کی ہمیشہ کسی ایک کی ہوگی - اس بنا پر حق و باطل کا جھگڑا یا حق و باطل کے نام پر انسانوں کا جھگڑا ہمیشہ جاری رہے گا -

انسان وہ مخلوق ہے جس میں عقل کی کمی اور نیت کی خرابی کے تناسب کا اندازہ کرنا ممکن نہیں - آج تک یہ مسئلہ لاینحل رہا ہے کہ عقل کی کمی کے باعث اس کی نیت خراب رہا کرتی ہے یا نیت کی خرابی کے باعث وہ کم عقل نظر آتا ہے - دُنیا میں ایسے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں نیت کی خرابی کم عقلی کا نقاب اوڑھ لیتی ہے اور ایک شخص کے اندر عقل کی کمی دوسرے کے اندر نیت کی خرابی کا باعث بنجاتی ہے

اخلاقی اعتبار سے انسان کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں - نیک اور بد - یا مذہب کی اصطلاح میں معصوم اور گنہگار - عام عقیدہ یہ ہے کہ انسان دُنیا میں معصوم آتا ہے اور یہاں سے گنہگار جاتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان معصوم پیدا ہوتا ہے اور ماحول کے اثر سے بدی میں مبتلا ہو جاتا ہے - اگر بدی کی طرح نیکی کا تعلق بھی انسان کی نیت اور ارادے سے ہے تو یہ بات غور طلب ہے کہ بچوں کو معصوم کہنا کہاں تک درست ہے - بچوں میں جس طرح بدی کی صلاحیت نہیں پائی جاتی اسی طرح نیکی کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی - ایسی صورت میں ان پر معصومیت کا لیبل لگانے کی بجائے کسی اور صفت کا لیبل کیوں نہ لگایا جائے - اگر بچے اور بچوں کے والدین بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات اور بھی کہوں - وہ یہ کہ اگر موروثی خصوصیات (Heredity theory) والا نظریہ صحیح ہے تو کسی بچے کو معصوم کہنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ اس کے والدین معصوم رہے ہیں یا نہیں -

سیاسی اعتبار سے انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - غلام اور آزاد - غلام آزادی کے خواہش مند رہا کرتے ہیں اور آزاد حکمرانی کے آرزومند - غلاموں اور آزادوں کی اسی نفسیات نے ظالموں اور مظلوموں کے طبقے پیدا کئے ہیں - مظلوموں کو ظلم اور ظالموں سے نفرت ہوتی ہے مگر اُسی وقت تک جب تک وہ خود مظلوم ہوتے ہیں - ظلم سے نجات پا کر انھیں ظالم بنتے دیر نہیں لگتی - مظلوم اور ظالم میں یا صید اور صیاد میں فطرت کا اتنا فرق نہیں ہے جتنا حالت کا -

بعض فلسفیوں کے نزدیک بدی ناداری کا نتیجہ ہے - گویا بدی ناداروں کی مادی ضرورت ہے یا ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ -

بدی اور مادی ضرورت کا باہمی رشتہ مسلّم لیکن بہت سی برائیاں ایسی بھی ہیں جو فن برائے فن کے تحت آتی ہیں ان کے ارتکاب میں ناداروں اور سرمایہ داروں کی کوئی تفریق نہیں - دونوں اپنی اپنی بساط کے مطابق جی بھر کر ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں - یہ جاننے کے باوجود کہ برائیوں سے احتراز کا انعام اور ان کے ارتکاب کا انجام کیا ہے انسان برائیوں کی طرف زیادہ مایل رہا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ گناہ کے لذائذ ثواب کے فوائد سے زیادہ دلکش ہوتے ہیں -

بدی کی طرف بے اختیار کھنچنے کے معنی یہ نہیں کہ انسان کے دل میں نیکی یا خیر کی کوئی وقعت نہیں، انسان نیکی یا خیر کا احترام ضرور کرتا ہے لیکن اس کی افتادِ طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ نیکی یا خیر کا احترام کرنے کے باوجود اس سے محبت نہیں کر پاتا انسان کی محبت کا مرکز بدی یا شر ہے - انسان نیکی کا احترام اس لئے کرتا ہے کہ اسے اپنا فرض سمجھتا ہے - بدی سے محبت اسلئے کرتا ہے کہ یہ اس کی فطرت ہے - انسان کے فرض و فطرت کا یہی تضاد ادب اور زندگی میں کمیڈی اور ٹریجڈی دونوں کا مواد فراہم کرتا ہے -

جنگ بازی انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے - وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے جنگ کرتا رہا ہے - کبھی اخلاق و مذہب کے نام پر کبھی ملک و ملت کے نام پر کبھی عورتوں کی عزت و عصمت کے نام پر اور کبھی اپنے وقار و وقعت کے نام پر - وہ جنگ کو ہمیشہ اپنی غیرت اور حمیت کا تقاضا سمجھتا رہا ہے - غیرت اور حمیت بھی عجیب چیزیں ہیں - اگر ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں عورت مرد کے درمیان محبت سماجی اور اخلاقی جرم کی حیثیت رکھتی ہے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص میری بہن یا بیوی سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنی غیرت اور حمیت کا ثبوت دینے کے لئے فوراً اس شخص کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتا ہے خواہ وہ اپنی خلوتوں میں محبت سے بدرجہا بدتر جرائم کا مرتکب کیوں نہ رہ چکا ہو - انسان اگر اپنے گریبان میں منھ ڈالے تو بڑے سے بڑے مجرم کو بھی معاف کر دے - لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اپنے گریبان میں منھ ڈالنے کی بجائے دوسروں سے دست و گریباں ہونے کا زیادہ عادی رہا ہے -

انسان کی تعمیر میں خرابی کی جو ایک صورت مضمر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تمام اچھے اداروں میں وہ برائیاں پرورش پاتی ہیں جن کے خاتمے کے لئے اُن اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا - ممکن ہے بظاہر یہ بات غلط اور غیر ممکن معلوم ہوتی ہو لیکن اگر آپ تھانوں، عدالتوں، اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹوں سے لے کر دنیا کی مختلف حکومتوں کی وزارتِ دفاع اور یو این او تک کے مقاصد اور اس کے طرزِ عمل پر نظر ڈالیں تو یہی غلط اور غیر ممکن بات صحیح اور ممکن نظر آئے گی -

یوں تو انسانوں کے بہت سے طبقے ہیں - لیکن ان میں ارباب مذہب، ارباب سیاست، سائنس داں، فلسفی، ادیب اور شاعران لوگوں کے طبقے سب سے زیادہ ممتاز ہیں - ارباب مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کے نام پر خدائی کرنے کے فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں - سیاست دانوں کے بارے میں اقبال کا یہ قول غالباً حرفِ آخر ہے کہ ع "جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست" اور جہاں ارباب سیاست جمہور کے ابلیس ہیں وہاں سائنس داں ارباب سیاست کے آلۂ کار - فلسفیوں کی سب سے دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دعوے کمزور اور دلایل مضبوط ہوتے ہیں - فلسفی اور سیاستِ داں میں فرق یہ ہے کہ فلسفی نظریے کا قائل ہوتا ہے اور سیاستداں نعرے کا - جہاں فلسفی کو ہر نعرے میں کسی نظریے کی تلاش رہتی ہے، وہاں سیاستداں کو ہر نظریے میں کسی نعرے کی جستجو رہتی ہے - ادیبوں اور شاعروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھیں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ اتنا نہیں آتا جتنا اسے بیان کرنے کا - وہ جس قدر دوسروں کو زندگی سے لطف اندوز ہونے میں مدد دیتے ہیں اتنا خود لطف اندوز نہیں ہوتے - ارباب مذہب سے لے کر ارباب شعر و ادب تک تمام طبقوں میں کم از کم ایک بات ضرور مشترک ہے - وہ یہ کہ سب کے سب اپنی اصلاح کے سوا باقی ہر ایک کی اصلاح کے درپے رہتے ہیں -

ایک روایت یہ ہے کہ جب خدا نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے کہا کہ انسان بہت ہی فتنہ و فساد برپا کرے گا اس لئے اسے پیدا نہ کرنا بہتر ہے - فرشتوں کے اندیشے تو صحیح ثابت ہو چکے - معلوم نہیں انسان کی تخلیق سے خدا کا مقصد پورا ہو سکا یا نہیں -

مطبوعات موصولہ

فکرِ جمیل مجموعہ ہے جناب جمیل مظہری کی غزلوں کا، ان میں اکثر غزلیں سنہ۴۰ء کے بعد کی ہیں اور کچھ غزلیں اس سے پہلے کی بھی * جو نظرِ ثانی کے بعد اس مجموعہ میں شامل کردی گئی ہیں۔ اس میں ایک حصّہ ان رومانی و جذباتی غزلوں کا بھی شامل ہے جن میں ہندی زبان کے تغزل کو زیادہ تر ہندی الفاظ ہی میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اخیر میں بعض تضمین اور رُباعیاں بھی مفردات کے ساتھ دیدی گئی ہیں۔

جناب جمیل مظہری، حضرت وحشت کلکتوی کے بڑے مشہور و ممتاز شاگرد ہیں۔ اپنے اسلوب بیان کی ندرت اور خیالات کی رفعت کے لحاظ سے وہ ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں روشِ عام سے ہٹ کر کہتے ہیں اور بڑے دلنشین و موثر انداز میں کہتے ہیں۔

ان کی شاعری پیش پا افتادہ جذبات و زبان کی شاعری نہیں بلکہ حسن ذہن و فکر اور تعبیر بلیغ کی شاعری ہے۔ اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس وقت صرف وہی ایک ایسے سخنگو ہیں جن کو "دبستان غالب" کا صحیح نمایندہ کہا جا سکتا ہے۔ فن کے لحاظ سے بھی وہ بڑے پختہ کار شاعر ہیں، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے بعض شعروں پر نظرِ ثانی کر لیتے تو بہتر تھا۔

مثلاً ان کا ایک مصرع ہے :- " لا تو تو ہوش میں پھر درسِ وفا دے لینا"

حالانکہ لا تو تو کی جگہ وہ آسانی سے " لاؤ تو" کہہ سکتے تھے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :- میں وہ پھول ہوں کہ جو اس چمن میں "گلہ گزار" صبا رہا

اس میں گلہ یائے وحدت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جو مناسب نہیں۔

ان کا ایک اور مصرع ہے :- وہ لاکھ جھکوائے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا

اس میں جھکوائے اچھی زبان نہیں، اس کے علاوہ یہ اور اب کہنے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا :-

وہ لاکھ سر کو مرے جھکا دے، مگر دل نہیں جھکے گا

حقیقت نے مگر پھینکا نہ ملبوسِ مجاز اپنا

پھینکنا اور اُتار پھینکنا ان دونوں میں فرق ہے۔ یہاں موقع اُتارنے یا اُتار پھینکنے کا تھا۔

ان کا ایک بڑا پاکیزہ شعر ہے :-

اسے آرزوئے سکوں عبث جو فریبِ شوق نہ کھا سکے مری حسرتوں کی یہ حد ہوئی کہ گناہ میں نہ مزا رہا

اس میں حد ہوئی نہ صحیح زبان ہے نہ اچھا انداز بیان۔ اس کی جگہ وہ کہہ سکتے تھے۔ "مری حسرتوں کا یہ حال ہے"

ایک اور شعر ہے :-

تیرگی حجاب تھی، روشنی حجاب تھی زندگی حجاب تھی جو بھی تھا حجاب تھا

شعر کہیں بلند ہو جاتا اگر دوسرا مصرع یوں ہوتا۔ "جس طرف نظر اُٹھی حجاب ہی حجاب تھا"

میں نے ظلمت کو بھی سمجھا ترے چہرہ کی نقاب — اک تبسم مری اس خوش نظری پر اے دوست

ظلمت کو تو سبھی نقاب سمجھتے ہیں، اس لئے بھی کا استعمال یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہاں ظلمت کی جگہ اگر جلوہ ہوتا تو بھی کا استعمال درست ہوسکتا تھا۔

جو ممکن ہو تو اک ٹھوکر لگا ان شب پرستوں کو — نسیم صبح کچھ ان کا بھی حق ہے تیرے جھونکے پر

شب پرست کے معنی رات بھر سونے والے کے نہیں بلکہ رات بھر جاگتے رہنے والے کے ہیں۔ اسی لئے خفاش کو فارسی میں "شب پرست" کہتے ہیں۔ اور اگر کسی تاویل سے اس کے معنی وہی لئے جائیں جو مقصود شاعر ہے تو بھی "شب پرستوں" سے بہتر لفظ سونے والوں تھا۔

ایک مصرع ہے :- سرِ عرش تیری جگہ کہاں اُتر آ قلوب گداز میں

اول تو قلب کی جمع قلوب تغزل پر بار ہے اس کے علاوہ "قلوبِ گداز" کی ترکیب، ترکیب اضافی ہے اور گداز بہ معنی گداختگی استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ "قلوبِ پُر گداز" تو صحیح ہے لیکن "قلوب گداز" نادرست۔

ایک جگہ انھوں نے "خواہشات کا روگ" نظم کیا ہے۔ حالانکہ خواہش (فارسی لفظ) کی جمع عربی قاعدہ سے ناجایز ہے۔

کہیں کہیں طویل بحروں میں وزن کا بھی جھول نظر آتا ہے مگر یہ تسامحات سب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جب ان کے یہ اشعار ہماری نگاہ نہیں بلکہ دل کے اندر سے گزر جاتے ہیں۔

امیدیں چھین لیں اس نے تو پھر گلہ کیا ہے — قرار مانگ رہے تھے قرار دے تو دیا
اگرچہ جبر ہے یہ بھی مگر غنیمت جان — کہ ایک جذبۂ بے اختیار دے تو دیا
ابھی دنیا حقیقت کا تحمل کر نہیں سکتی — ابھی کچی نگاہوں میں چھپا رہنے دے راز اپنا
اٹھلاتی ہیں ہر طرف نگاہیں — اللہ رے ناز تیرگی کا
کہتی تھی جنوں جس کو دنیا بگڑی ہوئی صورت عقل کی تھی — پھاڑا تھا گریباں تیرے لئے جب تو نہ ملا سینا ہی پڑا
بے حجابی میں بھی چہرہ سے اٹھاتے نہیں آپ — وہ نقاب رخِ زیبا کہ حیا جس کو کہیں
ہمیں رہ گئے بزم میں نیم بسمل — مگر تیری آنکھوں نے فرصت نہ پائی
میں ہوں کیا اور مری قیمت کیا ہے — اس تبسم کی ضرورت کیا ہے

اس قسم کے اشعار سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے اور ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جمیل کتنا بلند پایہ شاعر ہے اور اس کا ذوقِ شعر و سخن کس قدر لطیف و پاکیزہ ہے۔

یہ مجموعہ مکتبۂ ادب گردنی باغ پٹنہ سے مل سکتا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔

چراغِ منزل مجموعہ ہے شاہد صدیقی اکبر آبادی کے کلام کا، جن کا وطن ثانی اب حیدر آباد ہے۔ شاہد صاحب گو زمانۂ حال کے شاعر ہیں، لیکن ان کے مشقِ سخن کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کلاسکل شاعری تقویم پارینہ نہ سمجھی جاتی تھی اور اسی خصوصیت نے ان کو یہ سعادت عطا کی کہ جدید رجحانات شاعری کے سیلاب میں انھوں نے اپنے قدم اکھڑنے نہ دیے اور جو کچھ کہا تغزل کے اندر رہ کر کہا اور خوب کہا۔

محض حسن و عشق کی شاعری اب زیادہ مقبول نہیں اور اقتضاءِ زمانہ کے لحاظ سے اس میں یقیناً وسعت و گوناگونی پیدا ہونا چاہیے لیکن اگر اس کا پس منظر تغزل کے سوا کچھ اور ہوگیا تو پھر وہ شاعری تو رہے گی نہیں، فلسفہ و تصوف، پند و نصیحت، سب و شتم جو چاہے ہوجائے۔

شاہد صدیقی کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنی ہر فکر کو تغزل کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں، بہت کم کسی اور کے کلام میں نظر آتی ہے ان کے مزاج میں بڑی اپج ہے، اور وہ پرانی بات کو بھی ایسے خوبصورت نئے زاوئے سے پیش کرتے ہیں کہ اس میں طرفہ تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سلیقہ بالکل خداداد بات ہے اور اکتساب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں حیدرآباد کے دو شاعروں کا کلام ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ایک مخدوم محی الدین، دوسرے شاہد صدیقی اور اگر میں ان دونوں کے کلام کا موازنہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا Supplement ہے۔

ان کے کلام میں اچھے اشعار اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ غیر معیاری اشعار کی طرف نگاہ جاتی ہی نہیں۔ ..... وہ وقت کے نئے تقاضوں کو جس خوبصورتی و دلکشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس کی مثالیں اتنی کثرت کے ساتھ ہمیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ شاہد کی غزلگوئی یکسر مرصع نگاری ہے اور ان کا یہ مختصر سا مجموعۂ کلام جو ۹۵ صفحات اور سیکڑوں اشعار پر مشتمل ہے۔ اتنا منفح مجموعہ ہے کہ ہم اس کے کسی ایک شعر کو بھی نظری نہیں کہہ سکتے۔ ان کی مرصع نگاری کے ثبوت میں، ان کی ایک پوری غزل (بغیر انتخاب) پیش کی جاتی ہے :-

کبھی خرد کا کبھی عشق کا بہانا تھا،
مری حیات کا مقصد فریب کھانا تھا

تری نگاہ کو گہرائیوں میں جانا تھا
مرے سکوت کی ہر تہ میں اک فسانا تھا

چمن کے ایک ہی گوشہ میں ہے ہجوم بہار
یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا آشیانا تھا

خزاں کا خوف تھا غنچوں کو فصل گل میں مگر
وہ مسکرا کے رہے جن کو مسکرانا تھا

جہاں ہوا تھا انھیں پا شکستگی کا گماں
مسافروں کو وہیں سے قدم بڑھانا تھا

شبِ فراق کے مارے ہوئے نہ دیکھ سکے
طلوعِ صبح کا منظر بہت سہانا تھا

وہ بے خبر ہیں محبت سے جو یہ کہتے ہیں،
کسی کی یاد میں دنیا کو بھول جانا تھا

جہاں جہاں میں رکا، وقت کے قدم بھی رکے
مرا وجود خود اپنی جگہ زمانا تھا

حضورِ حسنِ مجالِ نظر نہ تھی شاہد
ہمیں تو اپنے مقدر کو آزمانا تھا

یہ مجموعہ دو روپیہ میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

تلوک چند محروم مجموعہ ہے ان چند سخنوروں اور نقادوں کی رائے کا جو محروم کی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں۔ محروم پنجاب کے ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کی مخصوص شاہراہ کو اعتقاداً اختیار کیا اور آج تک اس سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اعتقاد سے میری مراد یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو ایک مقدس فن کی حیثیت سے اختیار کیا اور اس پر اب تک قایم ہیں۔ اس مجموعہ میں ہر مکتبۂ خیال کے شاعر و نقاد کی رائیں شامل ہیں اور مشکل ہی سے ہمیں کوئی شاعر ایسا ملے گا، جس نے ان کے ذوقِ سخن کا اعتراف نہ کیا ہو ـــــ اخیر میں ایک مضمون ان کے لایق فرزند جگن ناتھ آزاد کا بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے اپنے والدِ محترم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مجموعہ ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا گیا ہے۔

قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔

گنجِ معانی مجموعہ ہے جناب تلوک چند محروم کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا۔ محروم اس دبستانِ شاعری کے رکن ہیں جسے زبان کے لحاظ سے لکھنؤ و دہلی کا سنگم کہنا چاہیے اور معنویت کے لحاظ سے کمیر جذباتی نقاشی۔ انھوں نے نظمیں، رباعیاں، قطعات اور غزلیں سبھی کچھ لکھی ہیں، اور ان میں کوئی صنف ایسی نہیں جس میں ان کی انفرادیت نمایاں نہ ہو۔ میری مراد

ان کی انفرادیت سے ان کے کلام کی وہ خصوصیت ہے جسے ہم صفائی، سنجیدگی وصداقت کا بہترین امتزاج کہہ سکتے ہیں۔ نظم نگاروں میں کم شعراء ایسے نظر آئیں گے جو موضوع کے دایرہ میں رہ کر محرومؔ کی طرح اظہار جذبات پر قادر ہوں، اور ایسا تو شاید کوئی نہیں جو فنی حیثیت سے مقررہ شاہراہ سے نہ ہٹا ہو۔

وہ نظم ہو یا رُباعی، قطعہ ہو یا غزل، ان کی "کارآگہی" اور وسعت مطالعہ ہر جگہ یکساں نظر آتی ہے اور اس دور کا تو خیر کیا ذکر ہے اُس دور میں بھی جب شعر و شاعری کا تعلق یکسر علم و فہم سے تھا، محرومؔ کا سا شعور رکھنے والے کم ہی پائے جاتے تھے۔

یہ مجموعہ نہایت سلیقہ سے مجلد شایع کیا گیا ہے اور سات روپیہ آٹھ آنے میں دہلی کتاب گھر نیا محلہ بنگش دہلی سے مل سکتا ہے۔

تعدد ازدواج

تالیف ہے مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی کی جس میں تین مضمون خلیفہ عبدالحکیم، جسٹس عبدالرشید، مولانا عبدالسلام ندوی کے شامل ہیں اور آٹھ خود اُن کے۔

مسلمانوں میں تعدد ازدواج کو جایز قرار دیا گیا ہے لیکن اس جواز کی عمومیت یقیناً محل نظر ہے کیونکہ جن حالات میں اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی تھی وہ زیادہ تر اُس وقت کے مصالح سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر بھی اس کے شرائط اتنے سخت رکھے گئے کہ ان کے پیشِ نظر تعدد ازدواج ناقابل عمل سی بات ہو جاتی ہے۔

اسی موضوع پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے اور روایتی و درایتی حیثیت سے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا جعفر ندوی اس وقت کے بہت باخبر علماء میں سے ہیں اور مذہبی مسایل پر اظہار رائے میں جرأت سے کام لینے میں زیادہ پس و پیش نہیں کرتے۔

یہ کتاب ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۲۔ کلب روڈ لاہور سے ایک روپیہ بارہ آنے میں مل سکتی ہے۔

تحدید نسل

تصنیف ہے مولانا شاہ محمد جعفر ندوی کی جس میں انھوں نے تحدید نسل (برتھ کنٹرول) پر نہایت سلجھے ہوئے معقول انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور شرعی و مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ ہیئت اجتماعی کے تمدنی و اقتصادی حالات کا اقتضا یہی ہے کہ اگر آبادی کو کم نہیں کیا جا سکتا تو اس کو بڑھانا بھی نہیں چاہیئے۔

مولانا نے اس سلسلہ میں جو روایات پیش کی ہیں ان میں تحدید نسل کو کوئی اچھا فعل تو قرار نہیں دیا گیا، لیکن انسے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے تحدید نسل کے باب میں لوگوں سے باز پرس بھی نہیں کی اور اس سے یہ فقہی استنباط ہو سکتا ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت ناشی ہو تو لوگوں کو "تحدید نسل" پر بھی عمل کرنا چاہیئے۔

یہ کتاب بھی ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شایع کی ہے۔ قیمت بارہ آنے۔ ضخامت ۵ ۷ صفحات۔

سرگزشت غزالی

ترجمہ ہے امام غزالی کی مشہور تصنیف المنقذ کا، مولانا محمد حنیف ندوی کے قلم سے جس میں ان کا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ غزالی تاریخ اسلام میں بڑی "ذوجہاتی" حیثیت رکھتے ہیں، وہ فیلسوف و متکلم بھی تھے، فقیہ و منہدس بھی، کوئی نقلی و عقلی راہ ایسی نہ تھی جس پر وہ نہ چلے ہوں، لیکن آخر کار انھوں نے تھک کر تصوف میں پناہ لی اور ایک بہت بڑے معلم اخلاق کی حیثیت سے سامنے آئے۔

عقاید کے سلسلہ میں غزالی کے خیالات اس زمانہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، کیونکہ اب زاویۂ فکر بالکل دوسرا ہو گیا ہے اور ان کے پیشِ نظر غزالی کے تفکرات و اجتہادات بہت سبک نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم بہ سلسلۂ تبصرہ ان تمام مسایل پر بحث نہیں کر سکتے، اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

تاہم ان کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب عقل انسانی نے زیادہ ترقی نہ کی تھی، ان کے خیالات یقیناً قابل قدر ہیں اور تاریخی حیثیت سے ان کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں فاضل مترجم کا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے جو اس میں شک نہیں بڑی اچھی تفسیر

ہے فلسفۂ غزالی کی۔

یہ کتاب بھی ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شایع کی ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔

راکھ اور کلیاں ناول ہے جناب کوثر چاندپوری کا جسے ادارۂ ادبیات جدید لاہور نے شایع کیا ہے۔ ادب و ادیب کا تعلق کس قدر عجیب و غریب ہے کہ ادیب جب ترقی کرتا ہے تو ادب میں گم ہوجاتا ہے۔ اسی چیز کو تصوف میں وحدت ذات وصفت کہتے ہیں اور ادبی دنیا میں واضع و موضوع کی تحلیل باہمی۔ بالکل یہی حال ہمارے کوثر صاحب کا ہے کہ ممکن نہیں ان کا نام زبان پر آئے اور ناول و فسانہ کی طرف خیال منتقل نہ ہو یا یہ کہ ناول و فسانہ کا ذکر چلے اور کوثر صاحب سامنے نہ آجائیں۔ وہ اس وقت تک اتنے اچھے فسانے، اتنے دلکش ناول لکھ چکے ہیں اور وہ ملک میں اتنے مقبول ہوچکے ہیں کہ اس فن میں ان کا نام ٹریڈ مارک ہوکر رہ گیا ہے اس لئے ان کے کسی ناول یا فسانہ پر کچھ لکھنا "تحصیل حاصل" سے زیادہ نہیں۔

یہ ناول ان کی بالکل حال کی تصنیف ہے گویا تخلص تو وہی ہے لیکن غزل تازہ ہے اور یکسر "کوثر و کوثریت"۔

اس ناول کا موضوع بھی عوام اور عوامی دنیا کی وہ اُلجھنیں ہیں جنھوں نے معاشرہ کے نشیب فراز کی وجہ سے زندگی کو ناہموار بلکہ بڑی حد تک سوگوار بنا رکھا ہے Have اور Have not کی کشاکش ہمیشہ سے جاری ہے، اسی کے ساتھ اس کو دور کرنے کی کوشش بھی۔ اور ہمارے کوثر صاحب نے بھی اس سلسلہ میں بڑا اہم اول ادا کیا ہے ان کے افسانوں اور ناولوں کا موضوع ہمیشہ عوام کا درد دکھ رہا ہے اور یہی موضوع زیر نظر ناول کا بھی ہے، جس میں تشاؤم نہیں بلکہ تفاؤل کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔

زبان کی خوبی، پلاٹ کا حسن، کرداروں کا تجزیہ، جذبات کی صداقت جو ان کی فنی خصوصیات ہیں وہ تو ہونا ہی تھیں لیکن اس میں ایک خصوصیت اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر ہم چاہیں تو اسے معاشرہ کے مستقبل کی پیشین گوئی بھی کہہ سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ ناول صرف پارۂ ادب ہی نہیں بلکہ سیپارۂ اخلاق بھی ہے۔

ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اطبائے عہدِ مغلیہ تصنیف ہے جناب کوثر چاندپوری کی جس میں وہ ناول نویس نہیں بلکہ ایک حکیم و ڈاکٹر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل فن طبابت ہی ہے، ساری عمر اسی فن کی خدمت میں بسر کی ہے، بھوپال میں افسر الاطباء کے عہدہ ہی سے آپ ریٹائر ہوئے ہیں، اور آپ کا مطب اب بھی مرجعِ عام ہے۔

ظاہر ہے کہ آپ سے بہتر لکھنے والا اس موضوع پر اور کون ہوسکتا تھا۔ یہ کتاب ۱۶۹ اطباء عہدِ مغلیہ کا ردیف وار تذکرہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔ یہ تصنیف نہ صرف تذکرہ ہے بلکہ ایک حیثیت سے تاریخ بھی ہے، جس سے عہدِ مغلیہ کی زندگی و معاشرت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کو ہمدرد اکاڈیمی کراچی نے شایع کی ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ۔ کاشکے اس میں بعض اکابر اطباء کی تصاویر بھی شامل ہوتیں۔ قیمت تین روپیہ چار آنے۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔

ذکرِ آزاد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم ۳۸ سال تک مولانا ابوالکلام کے رفیق رہے اور اس دوران میں انھوں نے مولانا ابوالکلام کو جس جس حال اور جس جس رنگ میں دیکھا، اس کو انھوں نے اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کردیا ہے۔

ظاہر ہے کہ مولانا عبدالرزاق سے زیادہ گھر کا بھیدی اور کون ہوسکتا تھا، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی لنکا ڈھانے کا انھوں نے بیان نہیں کیا۔ جس سے ایک طرف مولانا ابوالکلام کی عظمت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور دوسری طرف قابل مؤلف کے جذبۂ احترام پر بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مرحوم کی صحیح ذہنیت اگر معلوم ہوسکتی ہے تو صرف اسی کتاب سے کیونکہ یہ داستان رفاقت ہے پورے ۳۸ سال کی اور اس شخص کی بیان کی ہوئی ہے جو خود بھی اپنی جگہ بڑا صاحب علم و فضل تھا۔

مولانا کی خانگی زندگی، معاشی و معاشرتی کوائف، علمی اکتسابات، سیاسی مجاہدات، مذہبی رجحانات، اخلاقی میلانات۔ الغرض وہ تمام باتیں جو عبارت ہیں مولانا کی ذات سے، سب کی سب اس کتاب کے آئینہ میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور اگر کبھی "سوانح آزاد" مرتب کئے گئے تو بنیادی چیز یہی کتاب ہوگی۔

یہ کتاب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے صاحبزادہ احمد سعید صاحب ملیح آبادی نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے اور دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲/۵ ساگردت لین کلکتہ سے ساڑھے روپیہ میں مل سکتی ہے۔

نغمۂ حسرت

دوسرا مجموعہ ہے جناب شفقت کاظمی کی غزلوں کا۔ اس سے قبل جب پہلا مجموعہ "حسرت کدہ" شائع ہوا تو مجھے امید کم تھی کہ وہ اس زمانہ میں جبکہ صحیح تغزل سے لوگ بیگانہ ہو چکے ہیں، شفقت کا کلام مقبول ہوسکے گا لیکن یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بزم میں ابھی اہلِ نظر بھی موجود ہیں جنھوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شفقت صاحب دوسرا مجموعہ شائع کرنے کی ہمت کرسکے۔

قارئین نگار، شفقت صاحب کے لطیف و دلکش رنگ تغزل سے پوری طرح واقف ہیں اس لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ اس وقت دبستان حسرت کے تنہا یادگار وہی ہیں اور تغزل حسرت کی تمام لطافتیں و رنگینیاں انھوں نے اپنے کلام میں منتقل کرلی ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ علمی کتب خانہ مظفرگڈھ پاکستان۔

معاویہ

ترجمہ ہے عمر ابوالنصر کی کتاب کا، جناب شیخ محمد احمد پانی پتی کے قلم سے۔ ابوالنصر مشہور عربی مورخ ہے جس نے متعدد تاریخی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اکثر کا ترجمہ ہوچکا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف امیر معاویہ کی صحیح شخصیت کا تذکرہ ہے بلکہ اس عہد کی اُلجھی ہوئی عربی سیاست کا بسیط تبصرہ بھی۔ اس سلسلہ میں اس نے شیعی و خارجی تحریک پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔

یہ کتاب ایوان سپلبشرز الہ آباد سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

گلستانِ حدیث

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان لاہور کی پیشکش ہے جس میں مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری نے روزہ و نماز، حج و زکوٰۃ اور اخلاقی تعلیم وغیرہ کی ۴۰ حدیثیں یکجا کردی ہیں۔

مولانا موصوف بڑے صائب الرائے و رقیق النظر انسان ہیں اور ملائیت سے دور۔ اس لئے ان کی تصانیف میں ہمیں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جسے ہم موجودہ زمانہ کے اہل علم کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہچکچائیں۔ یہ ادارہ عرصہ سے بڑی اہم علمی و مذہبی خدمات انجام دے رہا ہے اور مولانا موصوف اسی ادارہ کے رکن خاص ہیں۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ۲۔ کلب روڈ لاہور۔

ابتدائی تعلیمی نفسیات

تصنیف ہے پروفیسر علاؤالدین صاحب اختر کی جو اسلامیہ کالج لائلپور میں شعبۂ فلسفہ و نفسیات کے صدر ہیں۔

نفسیات بڑا وسیع علم ہے اور اس کی شاخیں بھی بہت ہیں جن پر مغربی زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اُردو کے لئے یہ علم نیا ہے اور تعلیمی نفسیات اس سے زیادہ نیا۔ کیونکہ اس کا تعلق محض درس و تدریس کی دُنیا سے ہے اور ہمارے ملک میں جہاں اب تک "مکتب و ملا" کے اثرات محو نہیں ہوئے، اس طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے جن میں تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر نفسیاتی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر ہمارے

اساتذہ ان اصول کو سامنے رکھ کر بچوں کو تعلیم دیں تو پڑھے لکھے جاہلوں کے وجود سے ملک بڑی حد تک پاک ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ بیکاری و بیروزگاری بھی ختم ہو سکتی ہے جو زیادہ تر نتیجہ ہے غلط تعلیم کا۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھ کر بڑی ٹھوس خدمت علم و زبان کی انجام دی ہے لیکن اس سے استفادہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے مدرسوں کی نفسیات میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

یہ کتاب چار روپیہ میں قومی کتب خانہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

صدائے دل دوسرا مجموعہ ہے جناب ساحر بھوپالی کی غزلوں اور چند نظموں کا۔ پہلا مجموعہ سحر حلال کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ساحر صاحب بڑے ستم رسیدہ شاعر ہیں اور چونکہ ان کی شاعری یکسر اسی ستم رسیدگی کی داستان ہے اس لئے اسے اثر انگیز ہونا ہی چاہیئے۔ وہ خالص جذباتی شاعر ہیں اور جذبات ہی کی سہل و سادہ زبان میں وہ شاعری کرتے ہیں۔ وہ ندرت و معنی آفرینی کے جھگڑے میں نہیں پڑتے، بلکہ جو ان کے دل پر گزرتی ہے اسی کو نہایت سادگی سے ظاہر کر دیتے ہیں، اور سچ پوچھئے تو اسی کا نام غزل ہے۔

یہ مجموعہ حالی پبلشنگ دہلی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔

اجالے جناب احمد عظیم آبادی کی چند نظموں اور رباعیوں کا۔ احمد صاحب جانے بوجھے شاعر ہیں، جن کے کلام کا ایک مجموعہ سازینہ کے نام سے پہلے شایع ہو چکا ہے۔ وہ نظم، غزل اور رباعی سب کچھ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ نظم نگاری میں وہ آزاد شاعری کے پرستار ہیں اور غزلوں میں خوش بیانی کے۔ جو کچھ کہتے ہیں، سمجھ بوجھ کر کہتے ہیں، خاص جوش و ولولے سے کہتے ہیں

قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ۵۶ ٹانسا ایسٹ جمشید پور۔

کچھ یادیں کچھ افسانے اپورتاز ہیں جناب عارف حجازی کے جو پاکستان کے مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اور پاکستان ہی کے مختلف مناظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں یہ صنف سخن نیا تجربہ ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جناب عارف حجازی اس تجربہ میں کافی کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور زبان و بیان سے جتنی تصویر کشی ممکن ہے، اس کی پوری کوشش انھوں نے کی ہے۔ قیمت ۴ ۸ ۔ ملنے کا پتہ:۔ مشتاق بک ڈپو کراچی

تہذیب اور اس کے ہیجانات ترجمہ ہے فرائڈ کی کتاب "" کا جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ تہذیب کے اضطرار کا بڑا سبب لاشعور اور جنسی خواہشات کی ناآسودگی ہے۔ فرائڈ کا فلسفہ سمجھنا بہت مشکل ہے، خاصکر جبکہ اس کو ترجمہ سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اس کتاب کے فاضل مترجم جناب احمد سعید صاحب صدر شعبۂ فلسفہ و نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور نے اس کو اتنی خوبی کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کیا ہے کہ اس کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہا اور تھوڑے سے غور و تامل کے بعد ہر شخص اس کو ذہن نشین کر سکتا ہے۔

وہ حضرات جو فرائڈ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ استفادہ سے خالی نہیں۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ اردو اکاڈیمی سندھ۔ رحمت بلڈنگ نزد مسافر خانہ کراچی۔

تجربے اور روایت ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس کتاب میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک کے روایات و تجربات شعری کی تاریخ بیان کی ہے اور اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ وہ ایک مسلسل داستان معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ملک کے مشہور ادیب و نقاد ہیں اور اس وقت تک وہ علم و ادب کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے لئے بڑی مفید ہے جو اردو ادب کی تاریخ کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتے اور اختصار کے ساتھ تفصیل میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب اردو اکاڈیمی سندھ کراچی نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کی ہے۔ قیمت ہے۔ ضخامت ۲۱۵ صفحات۔

ایک زندگی ایک صدی

جناب تاجور سامری نے اس کتاب میں اپنے استاد پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا مطالعہ قلمبند کیا ہے جو زیادہ تر مرحوم کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ تاجور صاحب نے عرصہ تک کیفی صاحب سے مشورۂ سخن کیا، ان کے پاس رہے اور مشاعروں کی مختلف صحبتوں میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اس لئے تاجور صاحب کی یہ کتاب بڑی قریب کا مطالعہ ہے جس سے مرحوم کے ذوق و اخلاق پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کیفی صاحب کے چند خطوط اور اشعار بھی اخیر میں درج ہیں۔ کتاب کافی دلچسپ ہے۔

قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

معاشرتی نفسیات

یہ کتاب نتیجہ ہے ڈاکٹر سلیم (صدر شعبۂ نفسیات ان۔سی کالج لاہور) اور علاؤالدین نقر (صدر شعبۂ نفسیات اسلامیہ کالج لائلپور) کی مشترکہ سعی و کاوش کا۔

نفسیات کے مختلف شعبوں میں، معاشرتی نفسیات بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق براہ راست انسانی تمدن یا الفاظ دیگر انسانیت کے مختلف مظاہر سے ہے جن میں توارث سے لے کر تواردو تاثر اور تفاعل و تفاثر تک بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں اس فن کے پیچیدہ مسایل کو قلمبند کیا گیا ہے۔ فاضل مصنفین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تمام مسایل سادہ و عام فہم زبان میں پیش کریں، لیکن اس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

انگریزی اصطلاحات کے ترجموں سے بھی وہ توازن قایم نہیں رکھ سکے ایک طرف تو وہ Vicious circle. کا ترجمہ "شیطانی لوٹ چکر" کرتے ہیں اور دوسری طرف Learning اور Impulses. کا اضطرابات و آموزش۔ لیکن بہ حیثیت مجموعہ یہ کتاب یقیناً اردو علم و ادب میں بڑا اچھا اضافہ ہے۔

قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مجمع البحرین۔ ۴۔ مکلوڈ روڈ لاہور۔

عمرو بن العاص

تاریخ اسلام میں حضرت عمرو بن العاص کی شخصیت بڑی عظیم شخصیت ہے، نہ صرف اپنی شجاعت و لیاقت کے لحاظ سے بلکہ سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی۔ ان کی غیر معمولی شخصیت عہد نبوی ہی میں ابھر آئی تھی اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے زمانہ میں بھی بدستور نمایاں رہی۔ وہ صرف فاتح مصر ہی نہیں تھے بلکہ خلافت امویہ کے بھی اتنے بڑے حامی و مددگار تھے کہ اگر ان کا قدم درمیان نہ ہوتا تو غالباً قتل حسین سے پہلے ہی تاریخ کا رخ کچھ اور ہو جاتا۔

یہ کتاب اسی غیر معمولی انسان کی سیرت پر مشتمل ہے اور اس کے فاضل مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مشہور مصری مورخ) ہیں۔

اس کا ترجمہ جناب شیخ محمد احمد صاحب پانی پتی نے کیا ہے جو عربی کتابوں کے ترجمہ کرنے میں خاص مہارت و سلیقہ رکھتے ہیں اور شایع کیا ہے مکتبۂ جدید لاہور نے جو اس سے قبل تاریخ اسلام کی متعدد کتابوں کے ترجمے شایع کر چکے ہیں۔

قیمت پانچ روپیہ۔ ضخامت ۳۰۴ صفحات۔

تذکرہ شعراء قدیم تطہر نگر

شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ تطہر نگر، ترچناپلی کے کسی مقام کا نام ہے چہ جائیکہ اس دور افتادہ سرزمین میں اردو شاعروں کا وجود! کہ اس کو سن کر واقعی اردو کی وسعت پر حیرت ہو جاتی ہے

اس میں سب سے پہلے حضرت نظہر ولی کا ذکر کیا گیا ہے جو اب سے ۹۵۰ سال قبل وہاں پائے جاتے تھے، اس کے بعد عبدالرزاق راسخ، غلام مصطفےٰ مرغوب، فرحت، قمرالدین مہر، عاجزہ (خاتون)، امین الدین امین، عارف سہروردی، عبدالغفور راز، سیف، عزیز، انوری، ذوقی اور مصطفےٰ شعراء ترچناپلی کا ذکر کیا گیا ہے، مولف نے ہر ایک کا نمونۂ کلام بھی دیا ہے اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔

یہ تذکرہ جناب حسرت سہروردی کی کاوش کا نتیجہ ہے، جس کا ملک کو اعتراف کرنا چاہئے۔

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ :- اسلامیہ بک ڈپو کرنول۔

شاعری کے نئے دور

بھارتی گیان پیٹھ کاشی کا بڑا مشہور ہندی ادارہ ہے جو عرصہ سے اُردو کے شاعرانہ و ناقدانہ لٹریچر کو ہندی میں منتقل کرکے بڑی اہم ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔

یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں نئے دور کے اُردو شاعروں کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

شرح القصیدہ

اب سے تقریباً ۷۵ سال قبل سنہ ۱۸۹۳ء کی بات ہے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعوائے تجدید و مہدیت سے ملک کی فضا گونج رہی تھی اور مخالفت کا ایک طوفان ان کے خلاف برپا تھا۔ آریہ، عیسائی اور مسلم علماء سبھی ان کے مخالف تھے اور وہ تن تنہا ان تمام حریفوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے مخالفین کو "ہل من مبارز" کے متعدد چیلنج دئے اور ان میں سے کوئی سامنے آیا۔ ان پر منجملہ اور اتہامات کے ایک اتہام یہ بھی تھا کہ وہ عربی و فارسی سے نابلد ہیں۔ اسی اتہام کی تردید میں انھوں نے یہ قصیدۂ لفت عربی میں لکھ کر مخالفین کو اس کا جواب لکھنے کی دعوت دی، لیکن ان میں سے کوئی بروئے کار نہ آیا۔

میرزا صاحب کا یہ مشہور قصیدہ ۶۹ اشعار پر مشتمل ہے اور اپنے تمام لسانی و فنی محاسن کے لحاظ سے ایسی عجیب و غریب چیز ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، ایک ایسا شخص جس نے کسی مدرسہ میں زانوئے ادب تہ نہ کیا تھا، کیونکر ایسا فصیح و بلیغ قصیدہ لکھنے پر قادر ہوگیا۔ اسی زمانہ میں ان کے مخالفین یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ان کی عربی زبان کی شاعری غالباً ان کے مرید خاص مولوی نورالدین کی ممنون کرم ہے، لیکن اس الزام کی لغویت اسی سے ظاہر ہے کہ مولوی نورالدین خود میرزا صاحب کے بڑے معتقد تھے اور اگر میرزا صاحب کے عربی قصاید وغیرہ انھیں کی تصنیف ہوتے تو مرزا صاحب کے اس کذب و دروغ پر کہ یہ سب کچھ خود انھیں کی فکر کا نتیجہ ہے، سب سے پہلے مولوی نورالدین ہی معترض ہوکر اس جماعت سے علیحدہ ہوجاتے، حالانکہ مرزا صاحب کے بعد وہی خلافت کے مستحق قرار دئے گئے۔

یہ رسالہ میرزا صاحب کی اسی عربی قصیدہ کی شرح ہے جس کا ذکر ابھی ہوچکا ہے۔ یہ شرح مولوی جلال الدین شمس نے لکھی ہے جو کسی وقت بلاد عرب و انگلستان میں احمدی مبلغ کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ یہ شرح انھوں نے بڑی عقیدتمندانہ کاوش سے لکھی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کرچکے ہیں، یہ قصیدہ نہ صرف اپنی لسانی و فنی خصوصیات بلکہ اس والہانہ محبت کے لحاظ سے بھی (جو مرزا صاحب کو رسول اللہ سے تھی) بڑی پر اثر چیز ہے۔

یہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے :-

یا عین فیض اللہ و العرفان یسعیٰ الیک الخلق کالظمآن

اور اختتام اس شعر پر ہوتا ہے :-

جسمی یطیر الیک من شوقٍ علا یالیت کانت قوۃ الطیران

یہ رسالہ الشرکۃ الاسلامیہ، ربوہ (پاکستان) سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

"اے شاہدِ بازار"

(پروفیسر ایم۔ اے حفیظ۔ بنارسی)

دن ڈھلتے ہی روشن ہوئی جوں شمع سرِ شام
یوں خود کو سجائے ہوئے بیٹھی ہے لبِ بام
امیدِ خریدار میں جس طرح دکاندار
اے شاہدِ بازار!

ہونٹوں کو تبسم کا نیا ڈھنگ سکھایا
آنکھوں سے اشارے کئے غمزوں سے بلایا
ابرو کو بنایا کبھی چلتی ہوئی تلوار
اے شاہدِ بازار!

جو بھی تری بزمِ طرب و عیش میں آیا
سو ناز سے انداز سے دیوانہ بنایا
پیش آئی محبت سے کیا پیار کا اظہار
اے شاہدِ بازار!

صہبائے جوانی بہر انداز لٹائی،
چھیڑا کبھی نغمہ تو کبھی رقص میں آئی
سکوں کی کھنک لے گئی پازیب کی جھنکار
اے شاہدِ بازار!

مانا کہ تو اک داغ ہے دامانِ وطن پر
ہستی تری ناسور ہے اس پاک بدن پر
مجرم ہے مگر کون کسے کہئے گنہگار
اے شاہدِ بازار!

پیدا کسی حوّا کے گھرانے میں ہوئی تھی
تو بھی کسی سیتا ہی کے دامن میں پلی تھی
بدکار زمانے نے بنایا تجھے بدکار
اے شاہدِ بازار!

اے کاش کوئی تیری مصیبت کو سمجھتا
اے کاش کوئی تیری مدد کے لئے بڑھتا
اے کاش کبھی ہوتا یہاں تیرا کوئی غمخوار
اے شاہدِ بازار!

جب تک کہ نہ اخلاق کا معیار ہو اونچا
جب تک کہ نہ انسان کا کردار ہو اونچا
قانون سے حل ہوگا نہ یہ عقدۂ دشوار
اے شاہدِ بازار!

(شفقت کاظمی)

چارۂ راہ سے واقف نہیں کوئی لیکن،
تیرے اس لطف سے کیوں ہے دلِ شفقت محروم
آئی تھی بصد خروش لیکن،
خرد ہی تری کرم سے
ان جفاؤں پہ بھی ہم تجھ کو دعا دیتے ہیں،

ایک دنیا تیری جانب کو رواں ہے اے دوست
وہ جو سرمایۂ نازِ دگراں ہے اے دوست

راس آ نہ سکی ہمیں جوانی
کٹ جائے گی یوں بھی زندگانی
کتنے خوگر دۂ تسلیم و رضا ہیں اے دوست

عہدِ ماضی کی یاد

(جسونت رائے رعنا بلسوی)

عُمر بھر وہ یاد ہم کو، صبح و شام آتے رہے
جن کا کچھ حاصل نہ تھا ایسے پیام آتے رہے

پھیر لی کوئے بتاں سے دل کی جانب جب نظر
مدتوں تک بے وفاؤں کے سلام آتے رہے

کیا کروں تفصیل، کھلتا ہے محبت کا بھرم
جانے کس کس کے شبِ غم لب پہ نام آتے رہے

جو جگہ جس کی تھی پُر ہونے پہ خالی ہی رہی
یوں تو دُنیا میں بہت قائم مقام آتے رہے

اب انھیں جام و سبو سے دل میں ہوتی ہے خلش
پہلے کچھ دن جو سکونِ دل کے کام آتے رہے

انتظارِ شوق میں راتیں بسر ہوتی رہیں،
اور برسوں اُن کے آنے کے پیام آتے رہے

داستانِ شوق رعنا یوں مرتب ہوگئی
آنکھوں ہی آنکھوں میں اُلفت کے پیام آتے رہے

آج کا علم

(سعیدہ اختر)

'علم' کہ تھا جو کبھی زندگیٔ کائنات !
آج ہے اس علم سے تنگ جہانِ حیات !

'علم' کے فیضان سے نظمِ جہاں منتشر !
'علم' کے امکان سے خطرۂ صد حادثات !

نفرت و بغض و عناد، فکر و فریب و فساد !
کتنے بھیانک ہیں آج علم کے ذات و صفات !

مرکزِ صد قتل و خوں، مامنِ امن و سکوں !
نعرۂ جنگ و جدل، مژدۂ راہِ نجات !

علم کا وہ دور بھی مجھ کو ابھی تک ہے یاد
جب کہ یہی علم تھا محرمِ امن و نجات !

جادہ تھی ہر تیرگی .... روشنیِ علم سے !
ذرّے تھے خورشید و ماہ قطرے تھے آبحیات !

گل ہی نہیں خار بھی جانِ بہاراں تھے جب !
صبحِ دل افروز تھی صحنِ گلستاں کی رات !

اخترِ رنگیں نوا، اب وہ کہاں ہے فضا !
یاد دلاتی ہے کیوں گذرے ہوئے واقعات !

آشوبِ حرم

(ایک کردار)

پروفیسر شور (علیگ)

ہم نشینِ خدا رسول کے یار — خلد بر دوش، خالفتہ بکنار
سینہ قرآنِ جہل کا جزدان — قلب آیات کبر کا طومار
آنکھ عرفان و ہوش کی محراب — سینہ جہلِ بسیط کی دیوار
ہونٹھ پر "لا الٰہ الا اللہ"! — اور سینے میں زہرِ کشتہ دم و مار
جیب اقدس میں کفر کا فتوے — دستِ اطہر میں شرع کی تلوار
خلق بے دین و کافر و زندیق — آپ حور و قصور کے مختار
جنتِ گوش نرمیٔ آواز — قاتلِ ہوش گرمیٔ گفتار
اپنے لہجے میں پرنیان و حریر — اپنی فطرت میں خار کا آزار
چہرہ آئینۂ مسلمانی — سینہ سالوس و مکر کا زنگار
ہر نظر زہر میں بجھا ہوا تیر — ہر نفس ایک سانپ کی پھنکار
خود فریبی کی نیند جہل کی رات — بالشِ وہم و بستر پندار
چہرہ فکر و نگاہ کا غمّاز، — سر پہ عرفان و ہوش کی دستار
ہونٹھ پر آفتاب عالم تاب — اور سینہ تمام تیرہ و تار
جاہلوں کے جنید بغدادی — کم سوادوں کے رومی و عطار
خود گرو خود تراش افلاطون — اپنا تابوت اپنے دوش پہ بار
اپنی یزداں فریبیاں بھی حلال — اور تسبیح غیر بھی زنار
یعنی خفاش اور پھر اُس پر — صبح کے آفتاب پر یلغار
چشم و دل پر تعصبات کی گرد — ہوش سے جنگ، عقل سے پیکار
جیسے شب ہو سحر پہ دام فگن — جیسے ذرہ ہو آفتاب شکار
جیسے شبنم حریف دجلہ و نیل — جیسے خاشاک ہو ہوا پہ سوار
جیسے سورج پہ ہنس رہا ہو چراغ — جیسے اُلجھا ہو آندھیوں سے شرار
جیسے طوفاں پہ خس ہو حملہ طراز — جیسے ٹکرائے پربتوں سے غبار
تیکھی چتون کھنچے کھنچے تیور — گفتگو تیز خامشی تلوار!

در برابر چو گوسپندِ سلیم
در قفا ہمچو گرگ مردم خوار!

(متین نیازی)

ہستی سے اپنی آج ہوئے باخبر سے ہم
پہونچے کہاں ہیں گر کے تمہاری نظر سے ہم

غم سہتے سہتے عشق کی منزل وہ آگئی
اب یہ گماں ہے جیسے ہوں خود راہبر سے ہم

بیگانہ وار بے خطر و بے نیازِ شوق،
گزرے ہیں اس طرح بھی تری رہگذر سے ہم

نباہ کرلیا جس شخص نے زمانے سے
وہ بے نیاز رہے تیرے آستانے سے!

نقابِ رُخ تو اُٹھاؤ جھلک دکھاؤ تو،
ہم اپنی جرأتِ دیدار، آزما لیں گے

تم اپنی فکر کرو، دل کہیں نہ دُکھ جائے
ہمارا کیا ہے کہ ہم زہرِ غم بھی کھالیں گے

یادیوں بھی کسی کی آئی ہے
زندگی کا پیام لائی ہے

حُسنِ فطرت کا راز کیا کہیئے
اک مصوّر کی خود نمائی ہے

زندگی میں کوئی کشش نہ رہی
غم سے دامن بچا کے پچھتائے

اُس سے بے سود ہے اُمیدِ کرم
جو تغافل سے باز آجائے

(غنی احمد غنی)

کاوشِ سعی طلب کب مجھے راس آتی ہے
وہ جو ملتے ہیں تو پھر زندگی کھو جاتی ہے

شامِ غم دیکھ کے افسردہ مجھے یاد تری،
تیری زلفوں سے بھی اک شام چرا لاتی ہے

داد چاہے کوئی بربادیٔ دل کی کس سے
اب تو وہ آنکھ بھی ملتے ہوئے شرماتی ہے

ماہ وش کون یہ آیا ہے تصور میں قریب
چاندنی سی مری سانسوں میں گھلی جاتی ہے

جنبشِ لب کا کسے ہوش تری خلوت میں،
دل دھڑکنے کی بس آواز سنی جاتی ہے

وہی غارت گرِ دُنیائے سکوں بھی ہے غنی
زندگی جس کے تصوّر سے سکوں پاتی ہے

کاوش بدری (مدراس)

نویدِ صبحِ طرب ہے تری نظر کی کرن
قدم کا لوچ ہے یا جنبشِ بہارِ چمن

مرے قدم بقدم چل رہی ہے منزل بھی،
نہ شوقِ راہنمائی، نہ خدشۂ رہزن

ہر ایک گام ہے معمارِ جادۂ ہستی،
ہر ایک لمحۂ گذراں ہے وقت کی دھڑکن

خزاں کی دست درازی کی بات، کل کی ہے
ہیں چاک چاک ازل سے گلوں کے پیراہن